April 1998 • No. 257 • Rs. 8

آدمی زیادہ چاہتا ہے مگر اس کو تھوڑا ملتا ہے
لوگ اگر اس حقیقت کو جان لیں تو
ان کی زندگی سراپا اطمینان کی زندگی بن جائے
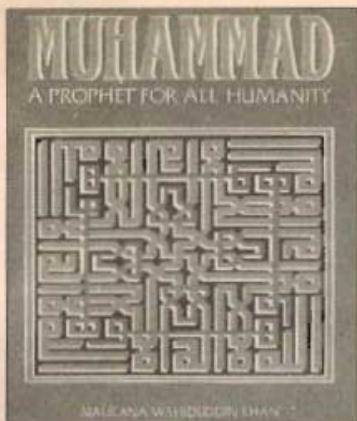
Size: 23.5×16cm,
Pages: 228; Rs. 125
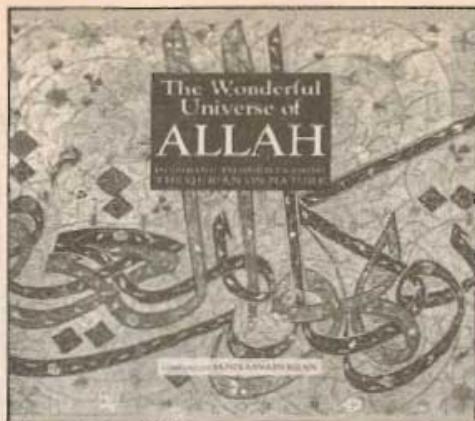
Size: 14×14cm,
Pages: 150; Rs. 95
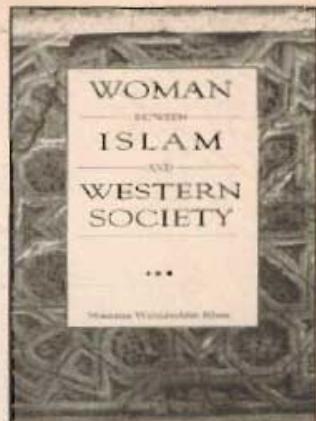
Size: 22×14.5cm,
Pages: 255; Rs. 95
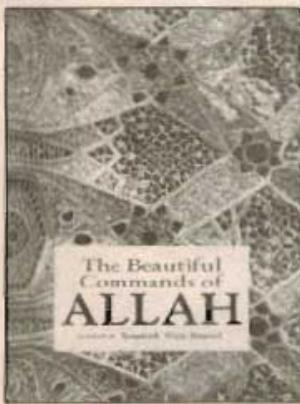
Size: 12.5×19 cm,
Pages: 192; Rs. 125
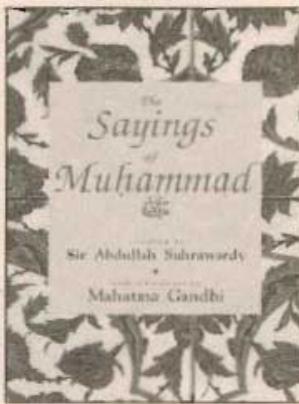
Size: 11.5×15 cm,
Pages: 128; Rs. 75
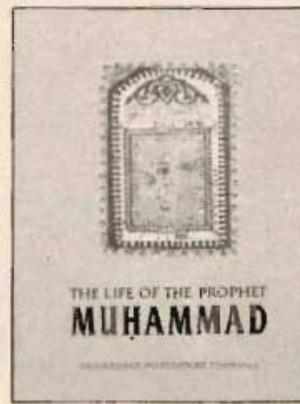
Size: 11.5×15 cm,
Pages: 64; Rs. 75
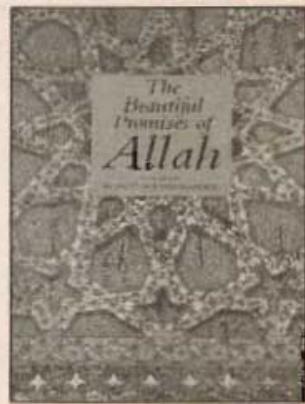
Size: 12.5×19cm,
Pages: 200; Rs. 175
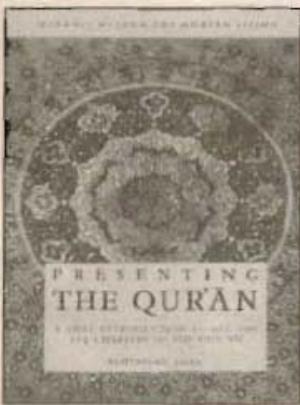
Size: 12.5×19cm,
Pages: 168; Rs. 165
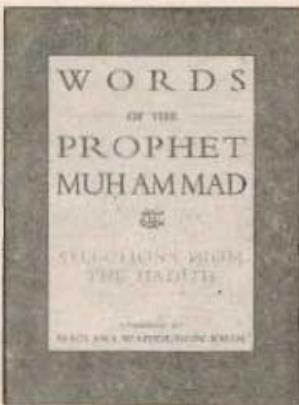
Size: 11.5×15cm,
Pages: 112; Rs. 75
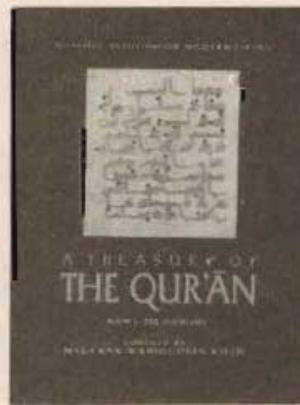
Size: 11.5×15cm,
Pages: 92; Rs. 75
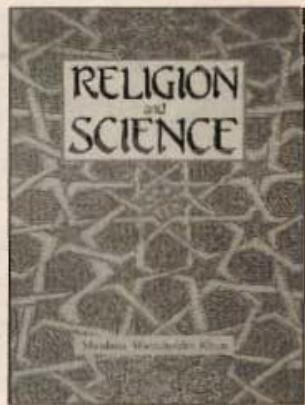
Size: 22×14.5cm,
Pages: 96; Rs. 55

AL-RISALA BOOK CENTRE

1, Nizamuddin West Market, Near DESU, New Delhi-110 013
Tel. 4611128, 4611131 Fax 91-11-4697333
e-mail: risala.islamic.@axcess.net.in.

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla

1, Nizamuddin West Market, Near DVB Office,
New Delhi-110013
Tel. 4611128, 4611131 Fax 4697333, 4647980
e-mail: risala.islamic@axcess.net.in
website: http://www.alrisala.org.

SUBSCRIPTION RATES

Single copy Rs. 8
One year Rs. 90. Two years Rs. 170.
Three years Rs. 250. Five years Rs. 400
Abroad: One year $ 20/£10 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY

IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577

DISTRIBUTED IN USA BY

MAKTABA AL-RISALA
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel. 718-2583435

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of
The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi.

اپریل ۱۹۹۸، شمارہ ۲۵۷

اسلامی اخلاق

شوہر اور بیوی کے درمیان اگر اختلاف ہو جائے تو اس وقت دونوں کو کیا کرنا چاہیے۔ اس کا حکم بتاتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ —— طلاق دو بار ہے۔ پھر یا تو قاعدہ کے مطابق رکھ لینا ہے۔ یا خوش اسلوبی کے ساتھ رخصت کر دینا (اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ) البقرہ ۲۲۹۔ یہ آیت اپنے ابتدائی مفہوم کے لحاظ سے شوہر اور بیوی کے تعلق کے بارے میں آئی ہے۔ مگر اسی کے ساتھ اس کا ایک وسیع تر انطباق بھی ہے۔ یہ آیت دراصل اسلام کی ایک اخلاقی اسپرٹ کو بتاتی ہے۔ اس اسپرٹ کا تعلق تمام انسانی تعلقات سے ہے۔

اجتماعی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان کوئی معاملاتی تعلق قائم ہوتا ہے۔ مثلاً مل کر سفر کرنا، مل کر ادارہ چلانا، مل کر تجارت کرنا، وغیرہ۔ اس طرح کے ہر ملاپ میں دو یا زیادہ انسان کبھی محدود مدت کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ ہو جاتے ہیں اور کبھی لمبی مدت کے لیے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ابتدائی مرحلہ میں مستقل تعلق کے نام پر دو شخصوں کے درمیان ملاپ قائم ہوتا ہے۔ مگر بعد کو ایسی صورتیں پیش آتی ہیں کہ ان کا باہمی تعلق ٹوٹ جاتا ہے۔

ایسے تمام معاملات میں اتحاد کے متعلق طرفین کو جس اسلامی اصول کی پابندی کرنی چاہیے وہ یہ ہے کہ یا تو خوش اسلوبی کے ساتھ تعلق کو باقی رکھیں، یا خوش اسلوبی کے ساتھ ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔

دو انسان جب کسی مقصد کے لیے باہم متحد ہوں تو شریعت انھیں یہ حکم نہیں دیتی کہ وہ ہر حال میں اپنے اتحاد کو باقی رکھیں۔ لیکن معاملے کے دونوں فریقوں کے لیے شریعت کا یہ لازمی حکم ہے کہ وہ اتحاد اور اختلاف دونوں حالتوں میں اخلاقی معیار کو ترک نہ کریں۔ دونوں میں سے کسی کو یہ حق نہیں کہ تعلق ٹوٹنے کے بعد ایک فریق دوسرے کو بدنام کرنے لگے یا اس کی جڑ اکھاڑنے کے لیے سرگرم ہو جائے۔

لوگوں کی مدد کرنا

قرآن میں ایمان لانے والے کی صفات یہ بیان کی گئی ہیں کہ وہ خدا کی محبت میں اپنا مال دے، رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافروں کو اور مانگنے والوں کو اور گردنیں چھڑانے میں (وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ) البقرہ ۱۷۷

یہ آیت بتاتی ہے کہ کسی آدمی کے اندر جب مومنانہ شخصیت پیدا ہوتی ہے تو خاندان اور سماج کے دائرہ میں اس کا اظہار کن کن صورتوں میں ہوتا ہے۔

فرمایا کہ وہ اپنے ضرورت مند رشتہ داروں کی مالی مدد کرنے لگتا ہے۔ رشتہ داروں سے چوں کہ ہر وقت تعلق ہوتا ہے اس لیے اکثر ان سے طرح طرح کی شکایتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ پھر یہ کہ رشتہ داروں سے بظاہر یہ امید نہیں ہوتی کہ وہ شکر گزاری یا نیازمندی کی صورت میں کوئی بدلہ دیں گے۔ اس لیے اسلام میں بہت زیادہ ابھارا گیا ہے کہ آدمی اپنے ضرورت مند رشتہ داروں کی مالی مدد کرے۔

اسی طرح یتیموں اور محتاجوں کی مدد کرنا مومن کے لیے بہت محبوب ہو جاتا ہے۔ اس کا دردمند دل اس بات کی ضمانت بن جاتا ہے کہ وہ کمزوروں کو دیکھ کر انھیں حقیر نہ سمجھے بلکہ ان کی مدد کے لیے دوڑ پڑے۔

یہی معاملہ مسافر کا ہے۔ مسافر اپنے وطن میں جیسا بھی ہو مگر جب وہ اپنے گھر سے دور سفر میں ہوتا ہے تو وہ بھی مختلف پہلوؤں سے ضرورت مند بن جاتا ہے۔ یہاں مومن کا ایمانی احساس متحرک ہو جاتا ہے۔ وہ اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتا جب تک مسافر کی ضرورت پوری کر کے اسے فارغ نہ کر دے۔ اسی طرح جو لوگ کسی وجہ سے مسائل کے درمیان گھر جائیں جو کسی سماجی روایت کی بندش میں پھنس کر رہ گئے ہوں۔ ان کے پاس خود اتنا مال نہ ہو کہ وہ اس کو دے کر وہاں سے چھٹکارا حاصل کر سکیں۔ ایسے لوگوں کو مال دے کر انھیں حالات کی گرفت سے آزاد کرانا بھی مومن کی انسانی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت ہے۔

بھلائیوں میں سبقت

قرآن (البقرہ ۱۴۸) میں ہے کہ—— ہر ایک کے لیے ایک رخ ہے جدھر وہ منہ کرتا ہے۔ پس تم بھلائیوں کی طرف دوڑو (وَ لِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ)
یہ آیت قبلہ کے مسئلہ کے ذیل میں آئی ہے۔ مگر قرآنی اسلوب کے مطابق، اس میں ایک بنیادی بات بتادی گئی ہے جس کا تعلق پوری انسانی زندگی سے ہے۔ فاستبقوا الخیرات کا لفظ سیاق کے اعتبار سے خصوصی مفہوم رکھتے ہوئے وسیع تر پہلو کے اعتبار سے ایک عمومی حکم ہے جو ہر انسان کو ہر لمحہ ایک بنیادی ہدایت دے رہا ہے۔

زندگی مسابقت کے اصول پر مبنی ہے۔ انسان کے اندر فطری طور پر یہ جذبہ موجود ہے کہ وہ آگے بڑھے اور ترقی کرے۔ اسی فطری جذبہ کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ ہر آدمی اپنی دوڑ لگا رہا ہے، ہر آدمی دوسروں سے آگے بڑھنے کے لیے اپنی پوری طاقت خرچ کر رہا ہے۔

مسابقت کا یہ جذبہ عام طور پر خواہش کے رخ پر چل پڑتا ہے۔ ہر انسان کے اندر جس طرح مسابقت کا جذبہ رکھا گیا ہے اسی طرح ہر ایک کے اندر مادی خواہشیں بھی پوری طاقت کے ساتھ موجود ہیں۔ اس بنا پر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مادی خواہش کا زور آدمی کے جذبۂ مسابقت کو ایک رخ پر دوڑا دیتا ہے۔ دنیا میں بیشتر لوگ زیادہ سے زیادہ مال حاصل کرنے کے لیے سرگرم ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کی اندرونی خواہش نے ان کے مسابقت کے جذبہ کو مال کے رخ پر موڑ دیا۔

مگر قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ آدمی مسابقت کے جذبہ کو خیر کے رخ پر سرگرم کرے۔ وہ اپنی مادی خواہشوں کو اپنی دوڑ کا نشانہ بنانے کے بجائے اس چیز کو نشانہ بنائے جس کو خدا نے خیر قرار دیا ہے۔ خیر سے مراد علم بھی ہے، جو آدمی کی ذہنی اور فکری ترقی کا ذریعہ ہے۔ اسی طرح اس سے دعوتِ حق بھی مراد ہو سکتی ہے جو کام کا اتنا وسیع میدان ہے جس کی حدیں کہیں ختم نہیں ہوتیں۔ اسی طرح بھلائیوں میں مسابقت کا ایک میدان وہ بھی ہے جس کو خدمتِ خلق کہا جاتا ہے۔

صلح بہتر ہے

قرآن میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ نزاع کی صورت میں دونوں فریق آپس میں صلح کرلیا کریں۔ اور صلح بہتر ہے، اور حرص انسانوں کی طبیعت میں بسی ہوئی ہے (النساء ۱۲۸)
یہ اصول انسانی زندگی کے تمام معاملات کے لیے ہے، خواہ اس کا تعلق گھر کے معاملہ سے ہو یا باہر کے معاملہ سے۔ خواہ وہ دو آدمیوں کا مسئلہ ہو یا پوری جماعت کا مسئلہ۔ خواہ وہ قومی ہو یا بین اقوامی۔ اجتماعی زندگی کے تمام نزاعی معاملات کا یہی واحد حل ہے۔

صلح کی قابل عمل صورت صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ معاملہ کے دونوں فریق اسٹیٹس کو (حالت موجودہ) پر راضی ہو جائیں۔ اس میں واحد رکاوٹ حرص ہے۔ معاملہ کا ایک یا دوسرا فریق حرص میں پڑکر اسٹیٹس کو کو توڑنا چاہتا ہے، بروقت ملے ہوئے پر راضی نہ ہو کر وہ مزید کو حاصل کرنا چاہتا ہے جس کے لیے فطری طور پر دوسرا فریق آمادہ نہیں ہوتا۔ بس یہی مزاج صلح میں رکاوٹ بن جاتا ہے اور پھر دونوں فریق انتہائی بے فائدہ طور پر لڑائی کو جاری رکھتے ہیں، یہاں تک کہ وہ اپنے ملے ہوئے کو بھی کھو دیتے ہیں۔

صلح کو اکثر لوگ نزاعی معاملہ کی سطح پر جانچتے ہیں۔ حالاں کہ یہ ایک ثانوی درجہ کی چیز ہے۔ زیادہ اہم اور زیادہ قابل لحاظ بات یہ ہے کہ صلح آدمی کے لیے نئے عمل کا دروازہ کھولتی ہے۔ صلح کے بعد آدمی کو اپنا سفر جاری رکھنے کا راستہ مل جاتا ہے۔ نزاع کی حالت سفرِ حیات کو روکتی ہے، اور صلح کا معاملہ زندگی کے رکے ہوئے سفر کو ازسرِنو جاری کر دیتا ہے۔

صلح کوئی پسپائی نہیں۔ صلح دراصل پریکٹیکل وزڈم (عملی حکمت) کا دوسرا نام ہے۔
صلح حقیقتِ واقعہ کا اعتراف ہے۔ صلح کا مطلب جذباتی مواقع پر غیر جذباتی فیصلہ لینا ہے۔
صلح یہ ہے کہ نزاعی معاملات میں آدمی اَنانیت کا شکار نہ ہو۔ وہ کسی چیز کو اپنے لیے پرسٹیج اشو (ساکھ کا مسئلہ) نہ بنائے۔ وہ ہمیشہ تدبّر اور انضباط کا طریقہ اختیار کرے نہ کہ جذباتیت اور اشتعال کا۔

ٹکراؤ عمل کا دروازہ بند کرنے والا ہے اور صلح عمل کا دروازہ کھولنے والا۔

اعتراف

کوئی آدمی جب ایک شخص کے فضل وکمال کا اعتراف نہ کرے تو اس کی وجہ ہمیشہ اس کا یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ کسی اور کا اعتراف کرنے سے اس کا اپنا قد چھوٹا ہو جائے گا۔ مگر وہ بھول جاتا ہے کہ ایسا کرکے وہ اپنے آپ کو زیادہ بڑے اندیشہ میں مبتلا کر رہا ہے۔ وہ یہ کہ خدا کے سامنے اس کا قد ہمیشہ کے لیے چھوٹا ہو جائے۔

ایک شخص کو اگر کوئی فضل وکمال حاصل ہے تو وہ اس کی اپنی ایجاد نہیں ہے۔ وہ براہ راست خدا کا عطیہ ہے۔ اس لیے اس کا اعتراف کرنا خدا کا اعتراف کرنا ہے، اور اس کا اعتراف نہ کرنا خدا کا اعتراف نہ کرنا۔ اس لیے آدمی کو چاہیے کہ عدم اعتراف کی روش اختیار کرتے ہوئے وہ خدا سے ڈرے۔ وہ اس کو انسان کا معاملہ نہ سمجھتے ہوئے وہ اس کو خدا کا معاملہ سمجھے۔

اس معاملہ کا ایک اور پہلو ہے جو بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ وہ یہ کہ دوسرے کا اعتراف کرنا سادہ طور پر صرف دوسرے کا اعتراف کرنا نہیں ہے۔ وہ خود اپنی شخصیت کے ارتقاء کا معاملہ ہے۔ آدمی دوسرے شخص کے فضل کا اعتراف کرکے اپنی انسانیت کو بڑھاتا ہے اور دوسرے شخص کا اعتراف نہ کرکے اپنی شخصیت کو انسانی اعتبار سے مجروح کر لیتا ہے۔

اعتراف اور بے اعترافی کا معاملہ مزید آگے بڑھ کر پورے سماج سے جڑا ہوا ہے۔ جب ایک آدمی دوسرے شخص کا اعتراف کرے تو وہ سماج میں اعلیٰ انسانی قدروں کو فروغ دیتا ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ دوسرے کی حیثیت کا اعتراف نہ کرے تو سماج میں ناقدری اور بے اعترافی کی روایات فروغ پائیں گی۔

اعتراف اور بے اعترافی کوئی سادہ معاملہ نہیں۔ اعتراف کرنے والا پورے سماج میں قدر دانی کی اعلیٰ روایت قائم کرتا ہے۔ اس کے برعکس اعتراف نہ کرنے والا پورے سماج کو ناقدری کے راستہ پر ڈال دیتا ہے۔ بے اعترافی اگرچہ ایک شخص کرتا ہے مگر اس کا اثر پورے سماج پر پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بے اعترافی کے معاملے میں آدمی کو آخری حد تک محتاط رہنا چاہیے۔

بڑائی کا جذبہ

انسان کا سب سے بڑا دشمن شیطان ہے۔ اسی لیے قرآن میں شیطان کو طاغوت کہا گیا ہے۔ ابتدائے حیات میں خدا نے شیطان کو یہ حکم دیا کہ وہ آدم کا سجدہ کرے مگر اس نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اس کے بعد خدا اور شیطان میں جو مکالمہ ہوا اس کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: خدا نے کہا کہ تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے روکا جب کہ میں نے تجھ کو حکم دیا تھا۔ ابلیس نے کہا کہ میں اس سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھ کو آگ سے بنایا ہے اور آدم کو مٹی سے۔ خدا نے کہا کہ تو اُتر یہاں سے۔ تجھے یہ حق نہیں کہ تو اس میں گھمنڈ کرے۔ پس نکل جا، یقیناً تو ذلیل ہے۔ ابلیس نے کہا کہ اس دن تک کے لیے تو مجھے مہلت دے جبکہ سب لوگ اٹھائے جائیں گے۔ خدا نے کہا کہ تجھ کو مہلت دی گئی۔ ابلیس نے کہا کہ چوں کہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے، میں بھی لوگوں کے لیے تیری سیدھی راہ پر بیٹھوں گا۔ پھر ان پر آؤں گا ان کے آگے سے اور ان کے پیچھے سے اور ان کے دائیں سے اور ان کے بائیں سے۔ اور تو ان میں اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔ خدا نے کہا کہ نکل یہاں سے ذلیل اور ٹھکرایا ہوا۔ جو کوئی ان میں سے تیری راہ پر چلے گا تو میں تم سب سے جہنم کو بھر دوں گا (اعراف ۱۲-۱۸)

انسان کی اصل کمزوری کیا ہے جس کی وجہ سے اس کے اندر اخلاقی برائیاں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ یہ ہے کہ ہر آدمی صرف اپنے آپ کو بڑا دیکھنا چاہتا ہے۔ اب چوں کہ انسانوں میں فرق ہے۔ یہاں خود فطرت کے قانون کے مطابق کوئی چھوٹا ہوتا ہے کوئی بڑا اس لیے آدمی جس کو اپنے سے بڑا دیکھتا ہے، اس کے خلاف وہ جلن میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ جلن آدمی کو منفی نفسیات میں مبتلا کر دیتی ہے۔ وہ اس کے پورے کردار کو منفی کردار بنا دیتی ہے۔

اپنے کو بڑا دیکھنے کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے۔ وہ اس لیے ہے کہ آدمی کو برابر عمل پر ابھارتا رہے۔ یہ اس جذبہ کا غلط استعمال ہے کہ آدمی حسد اور جلن کی نفسیات میں مبتلا ہو جائے۔ اور پھر ہر قسم کی اخلاقی برائیوں کو اپنے لیے جائز کرلے۔ سچا انسان وہ ہے جس کا حال یہ ہو کہ جب وہ کسی کو اپنے سے بڑا دیکھے تو یہ واقعہ اس کے لیے عمل کا جذبہ بیدار کرنے کا سبب بن جائے۔

شاکلہ کا مسئلہ

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ — اور ہم جب انسان کے اوپر انعام کرتے ہیں تو وہ اعراض کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ اور پیٹھ موڑ لیتا ہے۔ اور جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو وہ نا امید ہو جاتا ہے۔ کہو کہ ہر ایک اپنے شاکلہ پر عمل کر رہا ہے، پس تمہارا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ کون زیادہ ہدایت والے راستہ پر ہے (بنی اسرائیل ۸۳-۸۴)

انسان کی سوچ، متاثر سوچ (کنڈیشنڈ تھنکنگ) ہوتی ہے۔ مثلاً ایک آدمی دولت اور خوش حالی کے ماحول میں ہو تو اس کے اندر بے جا خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے سے باہر کسی شخص کو اہمیت نہیں دیتا۔ اور نہ کسی اور کی بات پر زیادہ دھیان دے پاتا۔ اس کے برعکس جو آدمی مصیبت اور بدحالی کا شکار ہو تو وہ حوصلہ کھو دیتا ہے۔ وہ ہر ایک کے بارے میں بے اعتمادی کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ دونوں ہی کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ اپنے قریبی حالات سے اوپر اٹھ کر سوچ نہیں پاتے اور نہ اپنے عمل کی بے لاگ منصوبہ بندی میں کامیاب ہوتے۔ یہی مثال تمام معاملات کے لیے ہے۔

مثلاً حدیبیہ کے وقت اہل مکہ نے سارے معاملہ کو حال کے اعتبار سے دیکھا اور اہل ایمان نے مستقبل کے اعتبار سے۔ اہل مکہ قریبی احوال میں گم تھے۔ اور اہلِ ایمان قریبی احوال سے اوپر اٹھ کر معاملہ کو دور اندیشی کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ حال کے اعتبار سے دیکھنے کی وجہ سے اہل مکہ کو نظر آیا کہ چودہ سو مسلمان اگر مکہ میں داخل ہو کر عمرہ کریں تو لوگوں کی نظر میں ان کا وقار ختم ہو جائے گا، اس لیے وہ ان کے مخالف بن گئے۔ اس کے برعکس اہل ایمان نے دیکھا کہ اگر امن کا معاہدہ کر کے وہ لوٹ جائیں تو اس کے نتیجہ میں دعوت کے غیر معمولی مواقع کھل جائیں گے اور حال کی ظاہری شکست مستقبل کی عظیم فتح میں بدل جائے گی۔

دنیا میں آدمی کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ اپنے محدود دائرہ سے اوپر اٹھ کر سوچ سکے۔ وہ ذاتی تعصبات کے بجائے عمومی حقائق کی روشنی میں اپنی رائے بنائے۔ وہ شاکلۂ انسانی میں گھر کر نہ رہ جائے بلکہ شاکلۂ ربانی کی سطح تک پہنچنے کی کوشش کرے۔

دُہراپن نہیں

خدا نے کسی انسان کے سینہ میں دو دل نہیں بنائے (الاحزاب ۴) اس کا مطلب ہے کہ خدا کو یہ پسند نہیں کہ آدمی کسی معاملہ میں دہرا انداز اختیار کرے۔ ڈبل اسٹینڈرڈ انسان پر خدا اپنی رحمت نہیں کرتا۔

سچا انسان وہ ہے جس کا حال یہ ہو کہ وہ جو کہے وہی کرے، اور جو اس کو کرنا ہے وہی بولے۔ بولنے کے وقت کچھ کہنا اور کرنے کے وقت کچھ اور کرنا، یہ خدا پرست انسان کا طریقہ نہیں۔

ڈبل اسٹینڈرڈ انسان ہی کا دوسرا نام منافق ہے۔ ایسا انسان اپنی حقیقی شخصیت کو چھپائے ہوئے ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کو خوش کرنے کے لیے ایسی بات بولتا ہے جس کے بارہ میں وہ سنجیدہ نہیں ہوتا۔ لوگوں میں مقبولیت حاصل کرنے کے لیے اسٹیج پر ایسی تقریریں کرتا ہے جس کو وہ گھر آتے ہی بھول جاتا ہے۔ ایسا انسان ایک ایکٹر ہے نہ کہ حقیقی معنوں میں ایک خدا پرست انسان۔

منافق اور مخلص انسان میں یہ فرق ہے کہ منافق انسان کا اندر اور باہر ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ اور مخلص انسان اندر اور باہر دونوں اعتبار سے ایک ہوتا ہے۔ منافق انسان کا مقصد لوگوں کی خوشنودی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اور مخلص انسان کا مقصد خدا کی خوشنودی حاصل کرنا۔

منافق انسان کے اندر فکری اور عملی تضاد پایا جاتا ہے کیوں کہ وہ حالات کو دیکھ کر اپنے فکر و عمل کو بدلتا رہتا ہے۔ مگر مخلص انسان کے یہاں تضاد نہیں ہوتا۔ کیوں کہ مخلص انسان کی سوچ اور اس کا کردار اٹل خدائی اصولوں کے ماتحت ہوتا ہے اور خدائی اصولوں میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔

اس دنیا میں مخلص انسان ہی خدا کا مطلوب انسان ہے۔ یہی وہ انسان ہے جو خدا کی ابدی رحمتوں کا مستحق قرار دیا جائے گا۔

خواہش پرستی نہیں

قرآن کی سورہ نمبر ۳۸ میں حضرت داؤدؑ سے خطاب کرتے ہوئے ایک اصولی بات فرمائی گئی ہے۔ فرمایا کہ تم خواہش کی پیروی نہ کرو، وہ تم کو خدا کے راستے سے بھٹکا دے گی (ص ۲۶)

خدا نے انسان کے لیے ایک درست راستہ مقرر کیا اور پھر ہر انسان کی فطرت میں اسی کی تمیز رکھ دی۔ انسان اگر اپنی فطرت کی اس خاموش رہنمائی کو سمجھے اور اس کی پیروی کرے تو وہ کبھی بے راہ نہ ہو، وہ زندگی کی شاہراہ پر سیدھا چلتا رہے یہاں تک کہ وہ آخری منزل پر پہنچ جائے۔

فطرت کی اس شاہراہ سے بھٹکانے والی چیز صرف ایک ہے اور وہ انسان کی خود اپنی خواہش ہے۔ یہ خواہش زندگی کے ہر موڑ پر انسان کو بہکاتی ہے۔ عقل مند وہ ہے جو اپنے آپ کو خواہش کے اثر میں نہ آنے دے۔ جو آدمی اپنی خواہش سے مغلوب ہو گیا وہ لازماً فطرت کے سیدھے راستہ سے ہٹ جائے گا، اور جو آدمی فطرت کی راہ سے ہٹ جائے اس کے لیے تباہی کے سوا اور کوئی انجام نہیں۔

آدمی کی خواہش اس کو مختلف طریقوں سے بھٹکاتی ہے۔ کبھی اس کو ظاہری رونقوں کے فریب میں الجھا کر گہری حقیقتوں سے دور کر دیتی ہے، کبھی وقتی فائدہ کی خاطر اس کو اس راہ سے ہٹا دیتی ہے جو مستقل فائدہ کی طرف جانے والی ہے۔ کبھی کسی معاملہ کو غیرت وحمیت کا سوال بنا کر آدمی کو مشتعل کر دیتی ہے۔ وہ انجام سے بے پروا ہو کر لڑنا بھڑنا شروع کر دیتا ہے۔ جس کا ایک طرفہ نقصان سب سے زیادہ خود اسی کو بھگتنا پڑتا ہے۔

آدمی کی خواہش، آدمی کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ جو شخص کامیاب زندگی گزارنا چاہتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی خواہش کو اپنے کنٹرول میں رکھے۔ نہ یہ کہ خود خواہش کے کنٹرول میں آجائے۔ خواہش پرستی کے مقابلہ میں دوسرا طریقہ اصول پسندی کا طریقہ ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ خواہشوں کا شکار نہ بنے بلکہ وہ اعلیٰ انسانی اصولوں کی پیروی کرے۔ اس کا ہر رویہ سوچے سمجھے اصول کے تحت متعین ہوتا ہو نہ کہ محض نفس اور خواہش کی پیروی کے تحت۔

صبر، عجلت

قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ —— پس تم صبر کرو جس طرح ہمت والے پیغمبروں نے صبر کیا، اور ان کے لیے عجلت نہ کرو (الاحقاف ۳۵) اس سے معلوم ہوا کہ ایک ہے صابرانہ عزیمت، اور دوسری چیز ہے بے صبری اور عجلت۔ ان دونوں میں کیا فرق ہے، اس کو سمجھنے کے لیے قرآن کی ان آیتوں کا مطالعہ کیجئے جو نبوت کے ابتدائی دور میں مکہ میں اتاری گئیں:

اے کپڑے میں لپٹنے والے، اٹھ اور لوگوں کو ڈرا۔ اور اپنے رب کی بڑائی بیان کر۔ اور اپنے کپڑے کو پاک رکھ۔ اور گندگی کو چھوڑ دے۔ اور ایسا نہ ہو کہ احسان کرو اور زیادہ بدلہ چاہو۔ اور اپنے رب کے لیے صبر کرو (مدثر ۱-۷)

سورہ مدثر کی ان آیات کی روشنی میں مذکورہ فرق کو متعین کیا جائے تو وہ یہ ہوگا کہ موجودہ حالات میں صرف انہی چند احکام پر عمل کرو، اور بقیہ تمام معاملات کو صبر کے خانہ میں ڈال دو۔

یعنی انذار و تبشیر کے انداز میں لوگوں کو مسئلۂ آخرت سے آگاہ کرو۔ اللہ کی عظمت و کبریائی تمہارا موضوع کلام بن جائے۔ اچھے اخلاق اور اعلیٰ کردار میں اپنے آپ کو ڈھال لو۔ ہر قسم کی اعتقادی اور عملی برائیوں سے آخری حد تک دور ہو جاؤ۔ لوگوں کے ساتھ بہتر سلوک کرو، مگر ان سے بدلہ پانے کے لیے نہیں بلکہ صرف اللہ کی رضا کے لیے۔

یہ گویا پانچ نکاتی پروگرام تھا جو اس وقت دیا گیا۔ اگرچہ اس وقت مکہ میں اس کے سوا بہت سے مسائل تھے۔ مثلاً کعبہ میں ۳۶۰ بتوں کا ہونا، سماج میں طرح طرح کے جرائم، مکہ کی پارلی منٹ (دار الندوہ) پر مشرکین کا قبضہ، عرب میں رومی ایمپائر اور ساسانی ایمپائر کا سیاسی نفوذ، وغیرہ۔ مگر ان سب پر صبر کا حکم دیا گیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ، اس وقت جن کاموں کے لیے نتیجہ خیز جدوجہد ممکن ہے، ان پر محنت کرو۔ اور جن کاموں میں بروقت نتیجہ خیز عمل ممکن نہیں ہے ان سب کو مستقبل کے حالات پر چھوڑ دو۔

ایک آیت

قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی صفت بتاتے ہوئے کہا گیا ہے کہ وہ کافروں پر سخت ہیں (اشداءُ علی الکفّار) الفتح ۲۹

کچھ لوگ اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ اہل اسلام کا برتاؤ غیر مسلموں سے نرمی کا نہیں بلکہ سختی کا ہونا چاہیے۔ ان کو ہمیشہ غیر مسلموں سے کڑا سلوک کرنا چاہیے۔ یہ بات سراسر غلط ہے۔ رسول اللہؐ کے بارہ میں حضرت عائشہؓ نے کہا کہ آپ کا اخلاق قرآن تھا (کان خلقہ القرآن) اگر اس آیت کا مطلب یہ ہو تو آپ کو اپنے معاصر غیر مسلموں سے کڑا برتاؤ کرنا چاہیے تھا۔ حالاں کہ ایسا نہیں۔ حدیث اور سیرت کی کتابیں بتاتی ہیں کہ آپ نے ہمیشہ اپنے زمانہ کے غیر مسلموں سے نرمی اور شفقت کا برتاؤ کیا۔ حتیٰ کہ بہت سے واقعات ہیں جب کہ کسی غیر مسلم نے آپ کے ساتھ سختی کا معاملہ کیا۔ اس وقت بھی آپ اس کے لیے نرمی کا پیکر بنے رہے۔

شدید کے لفظی معنی سخت کے ہیں۔ ھُوشدیدٌ علیّ کہا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ فلاں شخص کو اپنے اثر میں لانا مجھ پر سخت دشوار ہے۔ گویا اس سے مراد کڑا یا کرخت ہونا نہیں ہے بلکہ غیر اثر پذیر ہونا ہے۔ الحماسہ میں ایک شاعر کہتا ہے کہ جوانی کی عمر میں آدمی اگر مردانگی سے عاجز رہ جائے تو ادھیڑ عمر میں اس کو حاصل کرنا اس پر سخت دشوار ہوگا:

اِذا المرءُ اَعیتہُ المروءۃ ناشئاً　　فمطلبُھا کھلاً علیہِ شدیدٌ

مذکورہ قرآنی آیت کا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان اتنے پختہ ہوتے ہیں کہ وہ غیر مسلموں کا اثر قبول نہیں کرتے۔ وہ مکمل طور پر با اصول زندگی گزارتے ہیں۔ وہ غیر مسلم قوم یا غیر مسلم تہذیب کے درمیان رہ کر بھی ان کا اثر نہیں لیتے۔ آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مومن کا برتاؤ نرم کے بجائے سخت ہوتا ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کے درمیان اثر پذیر بن کر رہنے کے بجائے غیر اثر پذیر بن کر رہتا ہے۔ غیر مسلموں کا اثر لینے کے معاملہ میں وہ پتھر کی طرح سخت ثابت ہوتا ہے۔ اس آیت کا تعلق اصلاً برتاؤ سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق اس بات سے ہے کہ ہمیشہ با اصول انداز میں زندگی گزاری جائے۔

صبر کی اہمیت

پروگرام کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس کی حیثیت مثبت پروگرام کی ہو۔ اور دوسری وہ جو اتفاقی ضرورت کے تحت اختیار کی جائے۔ مثلاً صحت بخش غذا ہمارے جسم کی مستقل ضرورت ہے۔ اسی کے ساتھ کبھی جسم کو دوا کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر دوا کی حیثیت صرف وقتی مطلوب کی ہے۔ غذا ہمارے جسم کی مستقل ضرورت ہے اور دوا ہمارے جسم کی صرف اتفاقی ضرورت۔

یہی معاملہ دین کا بھی ہے۔ دین میں صبر کی حیثیت مثبت تعلیم کی ہے۔ صبر ہماری مستقل دینی ضرورت ہے۔ اس کے مقابلہ میں جنگ کی حیثیت صرف وقتی ضرورت کی ہے۔ صبر ایک عظیم نیکی ہے جو ہر وقت اور ہر حال میں مطلوب ہے۔ جب کہ جنگ صرف اس وقت مطلوب ہوتی ہے جبکہ انتہائی ناگزیر حالات میں بطور دفاع اس کی ضرورت پیش آ گئی ہو۔

صبر وہ اہم ترین اصول ہے جو موجودہ امتحان کی دنیا میں ہر وقت اور ہر شخص کو درکار ہے۔ صبر کے بغیر کوئی شخص اس امتحان کے مرحلے سے کامیابی کے ساتھ گزر نہیں سکتا۔

اس دنیا میں آدمی کو اپنے نفس کے مقابلہ میں صبر کرنا ہے۔ شیطان کی ترغیبات کے مقابلہ میں صبر کرنا ہے۔ دوسرے انسانوں کی طرف سے پیش آنے والی ناخوشگواریوں پر صبر کرنا ہے۔

صبر کی ضرورت ہر لمحہ اور ہر موقع کے لیے ہے۔ نقصان کے موقع پر صبر یہ ہے کہ آپ اپنے کو مایوسی سے بچائیں۔ فائدہ کے موقع پر صبر یہ ہے کہ آپ اپنے اندر اٹھنے والے برتری کے احساس کو کچل کر ختم کر دیں۔ بیماری کے موقع پر صبر یہ ہے کہ آپ آہ و فغاں نہ کریں۔ صحت کے موقع پر صبر یہ ہے کہ آپ اپنے اندر فخر و ناز کے جذبات کو نہ اٹھنے دیں۔ اشتعال انگیزی کے موقع پر صبر یہ ہے کہ آپ اپنے کو مشتعل ہونے سے بچائیں۔ اور جب کوئی شخص آپ کی تعریف کرے تو اس وقت صبر یہ ہوگا کہ آپ اس سے کبر کی غذا لینے کے بجائے سراپا تواضع بن جائیں۔

صبر کوئی انسانی قانون نہیں، وہ خود فطرت کا ایک قانون ہے۔ اس کا تعلق زندگی کے ہر معاملہ سے ہے، خواہ وہ معاملہ انفرادی ہو یا اجتماعی۔

احترام انسانیت

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ — تمام انسان خدا کی عیال ہیں۔ خدا کے نزدیک سب سے زیادہ اچھا انسان وہ ہے جو اس کی عیال کے ساتھ اچھا سلوک کرے (رُوی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال : الخلق کلھم عیال اللہ، واحب خلق اللہ تعالیٰ الیہ احسنھم صنیعًا الی عیالہ) ادب الدنیا والدین للبصری ۵۲۷

انسانی سماج کی بہتر تعمیر کے لیے ضروری ہے کہ لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے احترام پایا جائے، لوگ ایک دوسرے کی عزت کریں، لوگ ایک دوسرے کے قدرداں بنے ہوئے ہوں۔

احترام کا یہ جذبہ لوگوں کے اندر کس طرح پیدا کیا جائے۔ اس کا سب سے زیادہ موثر اور کامیاب طریقہ یہ ہے کہ یہ حقیقت لوگوں کے ذہن نشین کرائی جائے کہ جس خالق نے مجھ کو پیدا کیا ہے اسی خالق نے دوسرے انسانوں کو بھی پیدا کیا ہے۔ تمام انسان گویا ایک خدا کا کنبہ ہیں۔ تمام انسان ایک خدا کے عیال کی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہ شعور آدمی کے اندر یہ جذبہ پیدا کرتا ہے کہ وہ اپنے اور دوسرے میں فرق نہ کرے۔ وہ دوسرے کو بھی اتنا ہی قابل قدر سمجھے جتنا وہ خود اپنے آپ کو قابل قدر سمجھ رہا ہے۔ کسی انسان کی تحقیر کرتے ہوئے وہ محسوس کرے کہ میں نے خدائی کنبہ کے ایک فرد کی تحقیر کی۔ اسی طرح جب وہ کسی انسان کو عزت دے تو وہ اس سے یہ خوشی حاصل کرے کہ اس نے خدائی کنبہ کے ایک فرد کو عزت و احترام دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی انسان کے لیے اس سے بڑی کوئی سعادت نہیں کہ وہ ایک ایسا عمل کرے جو اس کو یہ خوشی دے رہا ہو کہ میں نے خدائی کنبہ کے ایک شخص کو عزت دی ہے۔ خدائی کنبہ کے ایک شخص کے ساتھ احترام کا معاملہ کیا ہے۔ یہ نظریہ ایک طرف آدمی کو خدا کی نظر میں قابل انعام بناتا ہے۔ اسی کے ساتھ اس کا ایک عظیم فائدہ یہ ہے کہ اس عمل کے دوران انسان کے اندر اعلیٰ احساسات جاگتے ہیں۔ وہ دوسرے کو عزت دے کر خود اپنے آپ کو ایک باعزت انسان بنالیتا ہے۔

قدرت کے باوجود

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ — جب تم کو اپنے دشمن پر قدرت حاصل ہو جائے تو اسے معاف کرنے کو اس پر اپنی قدرت کا شکرانہ بنالو

(رُوی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال: اذا قدرت علی عدوِّک فاجعل العفو عنہ شکراً للقدرۃ علیہ) ادب الدنیا والدین للبصری، صفحہ ۳۰۰

اخلاق کیا ہے۔ اخلاق اعلیٰ انسانی کردار کا دوسرا نام ہے۔ انسانی تعلقات میں کسی شخص سے جس اعلیٰ سلوک کی توقع کی جاتی ہے اسی کو اخلاق کہتے ہیں۔ کسی انسان کی انسانیت کو پہچاننے کا معیار یہی اخلاق ہے۔

ایک شخص سے آپ کی دشمنی ہوگئی۔ پھر ایسے حالات پیش آئے کہ آپ نے اس کو زیر کرکے اس کے اوپر قابو پالیا۔ اس وقت ایک صورت یہ ہے کہ آپ اس معاملہ کو صرف انتقام کی نظر سے دیکھیں، آپ یہ سوچیں کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ اس سے بھرپور بدلہ لیا جائے اور اپنے انتقام کے جذبات کو ٹھنڈا کیا جائے۔ مگر یہ نہایت چھوٹی سوچ ہے، اعلیٰ انسانیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آپ سارے معاملہ کو خدا کی نظر سے دیکھیں۔ آپ اپنی کامیابی کو خدا کی طرف سے ملی ہوئی کامیابی سمجھیں۔ ایسی حالت میں آپ کے جذبات بالکل مختلف ہوں گے اب آپ کے اندر شکر کا جذبہ ابھر آئے گا۔ اپنی کامیابی کے بعد شکر کی سب سے زیادہ اعلیٰ صورت آپ کو یہ دکھائی دے گا کہ آپ اپنے دشمن کو معاف کر دیں۔

قابو پانے کے باوجود دشمن کو معاف کر دینا کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ ایک زبردست قربانی کا معاملہ ہے۔ اس کے لیے باہر کے دشمن کو کچلنے کے بجائے، خود اپنے نفس کو کچلنا پڑتا ہے۔ اپنے اندر بھڑکتی ہوئی انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے بعد ہی کسی کے لیے یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ قابو پانے کے بعد بھی اپنے دشمن کو معاف کر دے۔

معاف کرنا ایک نیکی ہے۔ اور قدرت کے باوجود معاف کرنا سب سے بڑی نیکی۔

اصلاح کا جذبہ

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ — مومن، مومن کا آئینہ ہے۔ جب وہ اس میں کوئی عیب دیکھتا ہے تو اس کو درست کر دیتا ہے (المُؤْمِنُ مِرآۃُ المؤمِنِ، إذا رآی فیہِ عَیباً أصلَحہ) ادب الدنیا والدین للبصری، صفحہ ۳۸۱

انسان کی انسانیت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کا خیر خواہ ہو۔ ہر انسان دوسرے انسان کی بہتری چاہے۔ ہر انسان کا یہ حال ہو کہ وہ دوسرے انسانوں کو اپنا بھائی سمجھے، وہ ان کی ترقی پر خوش ہو، اور اگر کسی بھائی میں کوئی خرابی دیکھے تو وہ خیر خواہی کے جذبہ کے تحت اس کی اصلاح کے لیے مستعد ہو جائے۔

جس سماج میں لوگوں کا یہ حال ہو وہاں ہر انسان دوسرے انسان کے لیے آئینہ کی مانند ہوگا۔ اگر آپ آئینہ کے سامنے کھڑے ہوں تو وہ کسی کمی یا زیادتی کے بغیر آپ کے اصل چہرے کو دکھا دیتا ہے۔ اسی طرح ایک سچے انسان کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ جب بھی کسی دوسرے انسان کے اندر کوئی کمی یا خرابی دیکھتا ہے تو اس کا انسانی جذبہ اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے بھائی کو اس سے باخبر کر دے۔ سچے انسان کے لیے ایسے معاملہ میں چپ رہنا ممکن نہیں۔

آئینہ جب کسی کو اس کے چہرے کی خرابی دکھاتا ہے تو اس کے اندر کوئی برا جذبہ نہیں ہوتا۔ آئینہ کا کام صرف خرابی کو بتانا ہے نہ کہ خرابی والے انسان کو نیچا دکھانا۔ اسی طرح سچا انسان وہ ہے جو اپنے بھائی کو اس کی خرابی سے آگاہ کرے تو اس کے دل میں بھائی کے خلاف نفرت یا حقارت کا کوئی جذبہ نہ ہو، ایسا کرتے ہوئے نہ وہ اپنے آپ کو اونچا سمجھے اور نہ دوسرے کو نیچا۔ اس کا مقصد صرف عیب کی اصلاح ہو نہ کہ عیب کا اشتہار۔

آئینہ آدمی کے چہرہ پر کوئی دھبہ بتائے تو آدمی کسی رکاوٹ کے بغیر فوراً اس کو قبول کر لیتا ہے۔ مگر جب انسان کسی آدمی کو اس کا عیب بتائے تو اکثر وہ اس کو اپنی عزت اور غیرت کا مسئلہ بنا لیتا ہے۔ یہ جذبہ آدمی کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ انسان کی نشاندہی کو بھی اسی طرح خوش دلی کے ساتھ قبول کرے جس طرح وہ آئینہ کی نشاندہی کو قبول کرتا ہے۔

اپنا محاسبہ

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ — تم لوگ خود اپنا محاسبہ کرو اس سے پہلے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے (حاسبوا انفسکم قبل ان تحاسبوا) الترمذی

انسان موجودہ دنیا میں عمل کرنے کے لیے آزاد ہے مگر وہ انجام کے معاملہ میں آزاد نہیں۔ آپ کو اختیار ہے کہ جو چاہیں بولیں اور جو چاہیں کریں۔ مگر آپ کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ اپنے آپ کو اپنے قول وعمل کے انجام سے بچا سکیں۔

آدمی اپنی زبان سے کڑوا بول بولے تو ایسا نہیں ہو سکتا کہ سننے والوں پر کڑوے بول کا بھی وہی ردعمل ہو جو میٹھے بول کا ہوتا ہے۔ جو آدمی اپنی زبان سے کڑوا بول بولے اس کو جاننا چاہیے کہ اس کو بہر حال لوگوں کی طرف سے منفی ردعمل کی قیمت بھگتنی پڑے گی۔ جو آدمی بے سوچے سمجھے عمل کرے اس کو جاننا چاہیے کہ اس کا اس قسم کا عمل فطرت کے قانون کے مطابق اپنا نتیجہ ظاہر کرے گا نہ کہ اس کی ذاتی خواہش کے مطابق۔

آدمی کے قول وعمل کا ایک انجام وہ ہے جو فوری طور پر دنیا میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ دوسرا انجام وہ ہے جو موت کے بعد آخرت میں ظاہر ہوگا۔ آخرت کا انجام بھی بہر حال اسی طرح سامنے آنے والا ہے جس طرح دنیا کا انجام آدمی کے سامنے فوراً آجاتا ہے۔ آدمی کو بلاشبہ یہ اختیار ہے کہ وہ جو چاہے بولے اور جو چاہے کرے۔ مگر یہ اختیار کسی کو بھی حاصل نہیں کہ وہ اپنے قول وعمل کے انجام سے اپنے کو بچا سکے، نہ موجودہ دنیا میں اور نہ آخرت کی دنیا میں، جو مرنے کے بعد ہر ایک کے سامنے آنے والی ہے۔

ایسی حالت میں عقل مندی یہ ہے کہ ہر آدمی اپنا نگراں آپ بن جائے۔ ہر آدمی اس کو اپنا معمول بنالے کہ ہر روز وہ اپنا محاسبہ کرتا رہے۔ ہر آدمی اپنا بے لاگ جائزہ لے کہ اس نے جو کچھ کیا یا کہا، کیا وہ اس قابل تھا کہ اس کو کہا جائے اور کیا جائے، یا وہ اس قابل نہ تھا۔ قبل اس کے کہ آدمی کی کارگزاری کا انجام اس کے اوپر ٹوٹ پڑے اسے چاہیے کہ وہ اپنا محاسبہ کر کے پیشگی طور پر اس سے بچنے کے لیے فکر مند ہو جائے۔

تکمیلِ انسانیت

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— جس نے لوگوں سے معاملہ کیا پھر ان سے ظلم نہیں کیا۔ اور ان سے بات کی اور جھوٹ نہیں بولا۔ اور ان سے وعدہ کیا پھر ان کی خلاف ورزی نہیں کی تو وہ ان میں سے ہے جس نے اپنی انسانیت کی تکمیل کر لی

(رُوی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال: مَن عامل النّاس فلم یظلمھم، وحدّثھم فلم یُکذّبھم، ووعدھم فلم یخلفھم فھو مِمّن کمُلت مروءته) ادب الدنیا والدین للبصری، صفحہ ۵۰۱

کامل انسان کون ہے، کامل انسان وہ ہے جس کے اندر انسانیت کی اعلیٰ صفات پائی جائیں۔ جو ہر تجربہ میں اور ہر موقع پر یہ ثابت کرے کہ وہ حقیقی معنوں میں ایک انسان ہے نہ کہ انسان کی صورت میں صرف ایک حیوان۔

انسان کی پہچان اس کی صورت نہیں ہے بلکہ اس کا معاملہ ہے۔ جو آدمی دوسروں سے معاملہ کرتے ہوئے اپنی انسانیت کو قائم رکھے وہی سچا اور حقیقی انسان ہے۔ اس کے برعکس جو آدمی معاملہ کے وقت ان امیدوں کو پورا نہ کر سکے جو ایک انسان سے بحیثیت انسان کی جاتی ہیں تو وہ اپنی انسانیت کو ثابت کرنے میں ناکام ہو گیا۔

اس سلسلہ میں ایک انسانی صفت یہ ہے کہ آدمی جب کسی سے معاملہ کرے تو وہ اس کے ساتھ ظلم نہ کرے۔ وہ اپنے آپ کو اس سے روکے کہ وہ دوسروں کے ساتھ حق تلفی کرنے لگے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اسی چیز کو لے جو عدل و انصاف کے اعتبار سے اس کا حق ہے۔ اور جو چیز امر واقعہ کے اعتبار سے اس کا حق نہ ہو اس کو وہ ہرگز نہ لے، خواہ بظاہر وہ اس کو لینے کی قدرت رکھتا ہو۔

اسی طرح انسان کی انسانیت کا تقاضا ہے کہ وہ ہمیشہ سچ بولے، وہ کبھی اپنی زبان سے ایسی بات نہ نکالے جو حقیقت کے اعتبار سے جھوٹ ہو۔ اسی طرح انسان کی ایک اعلیٰ صفت یہ ہے کہ جب وہ کسی سے کوئی وعدہ کرے تو ہر حال میں وہ اس کو پورا کرے۔ کسی آدمی کے باکردار ہونے کی سب سے زیادہ یقینی پہچان یہی ہے۔

حُسنِ اخلاق

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— قیامت کے دن مومن کی ترازو میں سب سے زیادہ وزنی چیز اچھا اخلاق ہوگا۔ اور خدا اس شخص سے نفرت کرتا ہے جو بے حیائی کی بات بولے اور بدزبانی کرے (قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انَّ اثقل شيءٍ فِي مِيزانِ الْمومنِ يوم الْقيامَةِ خُلقٌ حَسنٌ و اِنَّ اللّٰه يُبغض الفاحش البذی) الترمذی

اخلاق انسان کی پہچان ہے۔ جیسا اخلاق ویسا انسان۔ کوئی آدمی اچھا لباس پہن کر اچھا آدمی نہیں بنتا۔ یہ دراصل اچھا اخلاق ہے جو کسی انسان کو اچھا انسان بناتا ہے۔

انسانی اخلاق کی پہچان سب سے پہلے اس کی زبان سے ہوتی ہے۔ زبان آدمی کی اندرونی شخصیت کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ کوئی آدمی اپنی اندرونی شخصیت کے اعتبار سے جیسا ہوگا ویسا ہی وہ اپنی زبان پر ظاہر ہوگا۔

جس آدمی کے اندر انسانیت ہو، وہ تواضع اور ہمدردی کے احساسات میں جی رہا ہو، جو اپنے آپ کو اس کا ذمہ دار سمجھتا ہو کہ اس کے اوپر دوسروں کے حقوق ہیں اور ان حقوق کو بہر حال ادا کرنا ہے۔ ایسا آدمی جب کلام کرے گا تو اس کی زبان میں دوسروں کی رعایت شامل ہوگی۔ وہ ہر حال میں انصاف کی بات بولے گا۔ اس سے دوسروں کو میٹھے کلام کا تحفہ ملے گا۔

اس کے برعکس جس آدمی کے دل میں کبر ہو، جس کا سینہ ذمہ داری کے احساس سے خالی ہو، جو دوسروں کے ساتھ ہمدردی کرنا نہ جانتا ہو۔ ایسا آدمی جب دوسروں سے کلام کرے گا تو اس کے کلام میں بے حسی ہوگی۔ اس کے الفاظ بدخواہی کی کڑواہٹ لیے ہوئے ہوں گے۔ دوسروں کی طرف سے اس کے خلاف کوئی سخت بات پیش آجائے تو وہ فوراً مشتعل ہو جائے گا اور بدگوئی اور بدگمانی کا انداز اختیار کر لے گا۔ اچھا انسان وہ ہے جو لوگوں کے درمیان پھول کی طرح رہے۔ اور برا انسان وہ ہے جو لوگوں کے درمیان اس طرح رہے کہ وہ لوگوں کے لیے کانٹا بنا ہوا ہو۔

امانت داری

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ — جس شخص نے اپنی امانت تمہارے سپرد کی۔ اس کی امانت اس کو واپس کرو۔ کوئی شخص تم سے خیانت کرے تب بھی تم اس کے ساتھ خیانت نہ کرو (اَدِّ الامانۃ الی من ائتمنک ولا تخن من خانک) الترمذی

عام حالت میں ایک آدمی اپنی فطرت پر ہوتا ہے، فطرت انسان کی نہایت صحیح معلّم ہے۔ چنانچہ عام حالت میں انسان وہی کرتا ہے جو اسے کرنا چاہیے۔ وہ امانتوں کو ادا کرتا ہے اور لوگوں کے ساتھ وہ سلوک کرتا ہے جو انسانیت کے مطابق ہو۔

انسان کی اصل جانچ عام حالت میں نہیں ہے بلکہ خاص حالت یا ہنگامی حالت میں ہے۔ مثلاً چھوٹی امانت کا معاملہ ہو تو آدمی اس کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کرتا۔ وہ وقت پر اسے ادا کر دیتا ہے۔ لیکن جب معاملہ کسی بڑی امانت کا ہو تو اس وقت وہ بدل جاتا ہے۔ وہ انسانی اور اخلاقی اصولوں کو توڑ کر یہ کوشش کرنے لگتا ہے کہ اس کو امانت ادا کرنا نہ ہو، دوسرے کی چیز کو وہ اپنے قبضہ میں لے لے۔

مگر یہ سخت غیر انسانی فعل ہے۔ امانت ہر حال میں قابلِ ادائیگی ہے۔ خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی حتیٰ کہ اگر صاحب امانت کے پاس اپنی امانت کے حق میں کوئی ثبوت موجود نہ ہو تب بھی وہی اپنی امانت کا مالک ہے اور امانت دار پر اس کی ادائیگی اسی طرح ضروری ہے جس طرح ثبوت کی موجودگی میں ضروری ہوتی ہے۔

انسان کا حال یہ ہے کہ عام حالت میں وہ لوگوں کے ساتھ بدمعاملگی یا خیانت نہیں کرتا لیکن جب کوئی شخص اس کے ساتھ خیانت کا معاملہ کرے تو وہ ردعمل کی نفسیات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ منفی جذبات سے مغلوب ہو کر وہ چاہنے لگتا ہے کہ جس نے اس کے ساتھ خیانت کا معاملہ کیا ہے وہ بھی اس کے ساتھ مزید اضافہ کے ساتھ خیانت کا معاملہ کرے۔ مگر ایک شخص کی خیانت دوسرے شخص کے لیے خیانت کو جائز نہیں کرتی۔

اخلاقی اصول

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ — تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے وہی پسند نہ کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے (لا یؤمنُ احدکُم حتّٰی یُحِبُّ لاخیہِ ما یُحِبُّ لِنفسِہٖ) متفق علیہ۔

اخلاق کا سادہ اور فطری اصول یہ ہے کہ آدمی دوسروں کے لیے بھی وہی چاہنے لگے جو وہ اپنے لیے چاہتا ہے۔ اور دوسروں کے لیے بھی اس سلوک کو برا سمجھے جس سلوک کو وہ اپنے لیے برا سمجھتا ہے۔

یہ ایک ایسا معیار ہے جو ہر ایک کو معلوم ہے۔ کوئی بھی شخص ایسا نہیں ہو سکتا جو اس حقیقت کو نہ جانتا ہو۔ یہ اصول ہر آدمی کو ایک ایسا اخلاقی معیار دیتا ہے، جس کی روشنی میں وہ بے خطا طور پر اپنے لیے صحیح رویہ کا فیصلہ کرے، اور جو رویہ غلط ہو اس کو چھوڑ دے۔

ہر آدمی جانتا ہے کہ اس کو اپنے خلاف سازش پسند نہیں، اس لیے اس کو چاہیے کہ وہ بھی کسی کے خلاف سازش نہ کرے۔ ہر آدمی کو ناپسند ہے کہ کوئی شخص اس کا بدخواہ بن جائے اس لیے اس کو چاہیے کہ وہ بھی کسی کے خلاف بدخواہی نہ کرے۔ ہر آدمی کو معلوم ہے کہ کڑوا بول اس کی پسند کے مطابق نہیں اس لیے اس کو چاہیے کہ وہ بھی کسی کو اپنے کڑوے بول کا تحفہ نہ دے۔ ہر آدمی یہ جانتا ہے کہ اگر اس کو بے عزت کیا جائے تو ایسا فعل اس کو بے حد ناگوار ہوگا اس لیے اس کو چاہیے کہ وہ کسی بھی حال میں کسی دوسرے آدمی کو بے عزت کرنے کی کوشش نہ کرے۔ ہر آدمی کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اگر اس کا مال چھینا جائے تو وہ کسی حال میں اس کو پسند نہیں کرے گا۔

یہی معاملہ پسند کا ہے۔ ہر آدمی کو اچھی طرح معلوم ہے کہ کیا چیزیں اس کو پسند ہیں۔ کن چیزوں کو پاکر اسے خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اب ہر آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے دوسرے بھائیوں کے لیے اس چیز کا حریص بن جائے جس کا حریص وہ خود بنا ہوا ہے۔ وہ دوسروں کو وہی دے جس کو وہ خود پانا چاہتا ہے۔ کسی سماج کے افراد اگر اس اصول کو اختیار کر لیں تو اپنے آپ وہ سماج ایک بہتر سماج بن جائے گا۔

بھلائی اور برائی

حدیث میں آیا ہے کہ ـــــ نوّاس بن سمعان صحابی نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ بھلائی اور برائی کیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا بھلائی حُسنِ خُلق کو کہتے ہیں اور گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹکے اور تجھ کو برا لگے کہ لوگ اس سے باخبر ہو جائیں (عن النواس بن سَمْعان الانصاری قالَ سألت رسُول الله صلی الله علیه وسلّم عَنِ البِرّ والإثم فقال البِرُّ حُسنُ الخُلق والإثمُ ما حاكَ في صَدرِك وكَرِهتَ انْ يطّلع عليهِ الناس) صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والادب۔

نیکی یا بھلائی ایک جذبہ ہے جو آدمی کے دل میں ہوتا ہے۔ اور وہ انسانوں سے معاملہ کرتے ہوئے اچھے اخلاق کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ نیکی اپنی اصل کے اعتبار سے ایک داخلی حقیقت ہے۔ اور روزمرہ کی زندگی میں ظاہر ہونے والا حسن اخلاق اس کا خارجی ثبوت۔

جس آدمی کے دل میں نیکی ہو جب وہ لوگوں سے ملے گا تو اس کے چہرہ پر خوشی کی جھلک آجائے گی۔ جب وہ بولے گا تو اس کے الفاظ میں خیر خواہی کا جذبہ بھرا ہوا ہو گا۔ اس کا اخلاقی رویہ ہر حال میں باقی رہے گا، خواہ دوسروں نے اس کو خوش گوار انداز میں خطاب کیا ہو یا ناخوش گوار انداز میں۔ مزید یہ کہ اس کی خوش اخلاقی حقیقی خوش اخلاقی ہو گی نہ کہ محض ظاہری اور مصنوعی خوش اخلاقی۔

برائی یا برا اخلاق کیا ہے، اس کا ایک سادہ معیار فطرت نے ہر آدمی کے اندر رکھ دیا ہے۔ اور وہ ضمیر ہے۔ جب بھی آدمی کوئی بات سوچے یا وہ کوئی بری کارروائی کرے تو فوراً اس کے سینہ کے اندر بیٹھی ہوئی ضمیر کی عدالت اس کو چوکنا کرتی ہے۔ وہ خاموش زبان میں اس سے کہنے لگتی ہے کہ یہ غلط بات ہے۔ تم کو چاہیے کہ تم اسے چھوڑ دو۔ آدمی اگر ضمیر کی آواز کی پیروی کرے تو وہ کبھی برائی میں مبتلا نہ ہو۔

ضمیر کی آواز کے ذریعہ خدا ہر انسان کو متنبہ کرتا ہے۔ ضمیر خدا کی حجت ہے۔ ضمیر کی آواز کو نظر انداز کرنا خدا کی آواز کو نظر انداز کرنا ہے۔

عفو و تواضع

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ — صدقہ دینے سے مال نہیں گھٹتا۔ اور بندہ جب معاف کرتا ہے تو خدا اس کی عزت میں اضافہ کر دیتا ہے۔ اور جو بندہ خدا کے لیے تواضع کرتا ہے خدا اس کو بلندی عطا کر دیتا ہے (مانقصت صدقۃٌ مِن مال وما زادَ اللہ عبداً بِعفوٍ الاعِزاً وما تواضع احدٌ لِلّٰہ الا رَفعَہُ اللّٰہ) صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والادب۔

اخلاق دوسرے لفظوں میں، دینے کا ایک معاملہ ہے۔ جب آدمی کسی سے اچھا بول بولتا ہے یا اس کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے تو وہ اس کو اپنی محبت دے رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح جب ایک شخص کسی دوسرے کی مالی مدد کرتا ہے تو وہ بھی اپنی چیز کو دوسرے کے لیے دینا ہوتا ہے۔

بظاہر یہ دینا یک طرفہ معلوم ہوتا ہے۔ یعنی آدمی دوسرے سے کچھ پائے بغیر اس کو اپنے پاس سے دے رہا ہے۔ مگر کوئی بھی اخلاقی معاملہ یک طرفہ معاملہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر دینے میں پانے کا راز چھپا ہوا ہے۔

جس سماج میں لوگ ایک دوسرے کی مالی مدد کریں، ان کے اندر جمع کرنے کے بجائے خرچ کرنے کا مزاج ہو، اس سماج میں دولت کی گردش بڑھے گی اور استحصالی ذہنیت کا خاتمہ ہوگا۔ ایسے ماحول میں یہ بالکل فطری بات ہے کہ دینے والا مختلف طریقوں سے اپنے دینے کے فوائد میں حصہ دار بن جائے۔ ایسے سماج میں جب عمومی بہبودی آئے گی تو اس کا فائدہ ہر ایک کو پہنچے گا یہاں تک کہ دینے والے کو بھی۔

جب کوئی شخص آپ کے سامنے سرکشی کرے اور آپ اس کے مقابلہ میں جوابی انداز اختیار نہ کریں بلکہ تواضع کا انداز اختیار کریں تو فطرت کا قانون حرکت میں آکر آپ کا درجہ اونچا کر دیتا ہے اور دوسرے کا درجہ نیچا۔ اس طرح تواضع کی روش اختیار کرنا عملی نتیجہ کے اعتبار سے آدمی کے لیے سرفرازی کا سبب بن جاتا ہے۔

خدا کا پسندیدہ معاشرہ

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— خدا بندے کی مدد پر ہوتا ہے جب تک کہ وہ اپنے بھائی کی مدد پر ہو (اللّٰہ فی عون العبد ما کان العبد فی عون اخیہ) صحیح مسلم

موجودہ دنیا کا نظام خدا نے فطرت کے جس قانون کے تحت بنایا ہے اس میں یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص اپنے کیے ہوئے کا انجام نہ پائے۔ اس قانون کا ایک پہلو یہ ہے کہ کوئی آدمی جب سماج کے دوسرے لوگوں کی مدد کرتا ہے، وہ ان کی ضرورت کے موقع پر ان کے کام آتا ہے تو پورے ماحول میں اس کے موافق فضا بننے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ یہ معاملہ اپنے آپ دوطرفہ بن جاتا ہے۔ جس نے دوسروں کی مدد کی تھی، دوسرے لوگ بھی مزید اضافہ کے ساتھ اس کی مدد کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

انسان کی مدد کرنا کسی پتھر کے اسٹیچو کی مدد کرنا نہیں ہے بلکہ زندہ اور حساس انسان کی مدد کرنا ہے۔ انسان کے اندر پائی جانے والی یہی زندگی اور حساسیت معاملہ کو دوطرفہ بنا دیتی ہے۔ مدد پانے والا اپنی فطرت سے مجبور ہو کر مدد دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

سماجی نظام کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا ہر فرد صرف اپنے بارے میں سوچتا ہو۔ اس کو اپنے مفاد کے سوا کسی اور چیز کی خبر نہ ہو۔ وہ وہاں حرکت میں آتا ہو جہاں اس کا ذاتی فائدہ ہے اور جہاں اس کا ذاتی فائدہ نہ ہو وہاں وہ بے حس و بے حرکت بن جائے۔ ایسا سماج خدا کی مدد سے محروم رہتا ہے۔ ایسے سماج میں اعلیٰ انسانیت کی فضا نہیں بنتی۔ اور جہاں اعلیٰ انسانیت کی فضا نہ ہو وہاں ہر ایک کو کہیں نہ کہیں اس کا برا انجام بھگتنا پڑتا ہے۔

دوسرا سماج وہ ہے جہاں ہر آدمی اپنی ضرورت پوری کرنے کے ساتھ دوسروں کی ضرورت پوری کرنے کے لیے بھی تیار رہتا ہو۔ جہاں ہر آدمی اپنے جذبات کے ساتھ دوسروں کے جذبات کا بھی لحاظ کرتا ہو۔ ایسے سماج میں اپنے آپ ہر طرف انسانیت اور اخلاق کی فضا قائم ہو جاتی ہے۔ ہر ایک کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے بھائیوں کے ماحول میں رہ رہا ہے نہ کہ غیروں کے ماحول میں۔

برائی کے بدلے بھلائی

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ — خدا برائی کو برائی سے نہیں مٹاتا بلکہ برائی کو اچھائی سے مٹاتا ہے۔ گندگی، گندگی کو صاف نہیں کرتی (اِنّ اللّٰہ لا یَمحُو السَّیِّئَ بالسَّیِّئِ وَلٰکِنْ یَمحُو السَّیِّئَ بِالْحَسنِ اِنّ الْخبِیْث لا یَمحُو الْخبِیْث) مسند احمد

لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ ہر آدمی خود اپنی فطرت کے زور پر یہ چاہتا ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ وہ سلوک کرے جو اس کو سماج میں سرخرو بنانے والا ہو۔ پھر آدمی کیوں ایسا کرتا ہے کہ وہ اعلیٰ اخلاق کی روش سے ہٹ جاتا ہے، اس کا سبب جوابی نفسیات ہے۔

سماج میں جب بھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی کے جذبات کو دوسرے آدمی سے کوئی ٹھیس پہنچے تو پہلا آدمی یہ سمجھنے لگتا ہے کہ میری عزت خطرہ میں آگئی۔ اپنی عزت کو محفوظ کرنے کا طریقہ اس کی سمجھ میں یہ آتا ہے کہ وہ دوسرے شخص پر جوابی حملہ کرکے معاملہ کو برابر کرلے۔ مگر یہ ایک غلط تدبیر ہے۔ ایسی کسی کارروائی کا کبھی کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلتا۔

جس طرح ایک گندگی کو دوسری گندگی کے ذریعہ پاک نہیں کیا جاسکتا اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ ایک غلطی کو دوسری غلطی کے ذریعہ درست کیا جائے۔ بداخلاقی کا جواب بداخلاقی نہیں۔ اس کی اصلاح کی بہترین تدبیر یہ ہے کہ جس آدمی نے بداخلاقی کا سلوک کیا ہے اس کے ساتھ حسنِ اخلاق کا سلوک کیا جائے۔

جب آپ برے سلوک کا جواب برے سلوک سے دیں تو فریق ثانی کے اندر انتقامی نفسیات جاگ اٹھتی ہے۔ وہ آپ کے لیے پہلے سے بھی زیادہ بڑا مسئلہ بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر آپ برے سلوک کا جواب اچھے سلوک سے دیں تو فریق ثانی کے اندر شرمندگی کا احساس جاگ اٹھے گا، وہ خود اپنے آپ کو ملامت کرنے لگے گا۔ اس کا یہ جذبہ خود ہی اس کو مجبور کرے گا کہ وہ آپ کے بارے میں اپنے رویہ کو درست کرلے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ کسی معاملہ کو اپنے انتقامی جذبہ کی تسکین کا مسئلہ نہ بنائے، بلکہ اس کو صرف حل کی نظر سے دیکھے۔

بہترین اخلاق

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ـــــ کیا میں تم کو بتاؤں کہ دنیا و آخرت میں لوگوں کا بہترین اخلاق کیا ہے۔ کہا گیا کہ ہاں اے خدا کے رسولؐ، آپ نے فرمایا کہ جو تم سے کٹے تم اس سے جڑو، جو تم کو محروم کرے تم اسے دو، اور جو تمہارے اوپر زیادتی کرے تم اسے معاف کرو (عَنْ عقبةَ بنِ عامِرٍ قالَ قالَ رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلّمَ ألا اخبرُكَ بافضلِ اخلاقِ اَهلِ الدُّنيا والآخِرةِ قالَ نعمْ قالَ تصلُ مَن قطعكَ وتُعطي مَن حَرمكَ وتعفو عمّن ظلمَكَ) البیہقی

دنیا میں آدمی کو بار بار تلخ تجربے پیش آتے ہیں۔ کوئی شخص ایک بات پر ناراض ہو کر آپ سے قطع تعلق کر لیتا ہے۔ کوئی شخص آپ کو محرومی کا تجربہ کراتا ہے۔ کوئی شخص آپ کے ساتھ زیادتی کا معاملہ کرتا ہے۔ ایسے مواقع پر عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کے اندر جوابی غصہ پیدا ہو جاتا ہے۔ لوگ چاہنے لگتے ہیں کہ جس سے انھیں تلخ تجربہ پیش آیا ہے اس کو بھی اپنی طرف سے تلخ تجربہ کرائیں تاکہ اس کو سبق حاصل ہو۔

مگر یہ اعلیٰ انسانی سوچ نہیں۔ اعلیٰ انسان وہ ہے جو اپنی عقل سے سوچے، جس کا رویہ خود اپنے سوچے سمجھے اصول کے تحت متعین ہوتا ہو نہ کہ دوسروں کے ردعمل کے تحت۔

ایسے انسان کا ذہن دوسروں کے رویہ سے برہم نہیں ہوتا۔ اس کی فکری پختگی اس کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ ردعمل سے اوپر اٹھ کر اپنے لیے جینے کی سطح پالے۔ وہ ہر ایک کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے، خواہ ان کی طرف سے اس کو برے سلوک کا تجربہ ہوا ہو۔

اس کی بلند فکری اس کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ بھی جڑا رہے جو اس کے ساتھ تعلق توڑنے کا معاملہ کرتے ہوں۔ وہ ان لوگوں کو بھی دینے میں خوشی محسوس کرے جو اس کو نہ دینے کا فیصلہ کیے ہوئے ہوں۔ کوئی شخص اس کے ساتھ ظلم و زیادتی کا معاملہ کرے تب بھی اس کا دل تنگ نہیں ہوتا، بلکہ وہ یک طرفہ طور پر ایسے لوگوں کو معاف کر دیتا ہے ـــــ اعلیٰ اخلاق بااصول انسان کا طریقہ ہے، اور کمتر اخلاق بے اصول انسان کا طریقہ۔

آدابِ کلام

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ۔۔۔ خدا اس شخص پر رحم کرے جس نے بھلی بات کہی اور اس کا فائدہ اٹھایا۔ یا وہ چپ رہا اور اس نے سلامتی پائی (رحِمَ اللّٰہ مَن قالَ خیراً فغنِم او سکتَ فسلِمَ) ادب الدنیا والدین، صفحہ ۴۳۳

اس دنیا میں جس طرح بولنا ایک کام ہے اسی طرح چپ رہنا بھی ایک کام ہے۔ کبھی حالات کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ آدمی بولے اور کبھی یہ ضروری ہوتا ہے کہ آدمی چپ رہے۔ وہ آدمی خوش قسمت ہے جو اس فرق کو جانے۔ ایسا آدمی خود بھی کامیاب ہوگا اور دوسروں کو بھی اس سے کامیابی کا تحفہ ملے گا۔

آدمی کو کب بولنا چاہیے، اس کی دو لازمی شرطیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے پاس کوئی ایسی بات ہو جو سچ مچ کہنے کے قابل ہو، یہ بات وہ ہوتی ہے جس پر آدمی نے مدتوں غور کیا ہو، اس نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ اس کے بارے میں ایک رائے قائم کی ہو، اس کا بولنا اپنی ذات کو نمایاں کرنے کے لیے نہ ہو بلکہ تمام تر سننے والوں کی خیر خواہی میں ہو۔

تاہم بولنے کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ آدمی کے پاس ایک صحیح بات ہے۔ اسی کے ساتھ آدمی کے لیے ضروری ہے کہ آدمی بے لاگ جائزہ کے تحت یہ دیکھے کہ اس کا بولنا نتیجہ کے اعتبار سے کیا ہوگا۔ بولنا صرف بولنے کے لیے نہیں ہوتا بلکہ کسی نتیجہ کے لیے ہوتا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ صرف اس وقت بولے جب کہ اس کو یقین ہو کہ اس کا بولنا کوئی مثبت نتیجہ پیدا کرے گا۔

جب آدمی کے پاس بولنے کے لیے کوئی بہت سوچی سمجھی بات نہ ہو یا حالات بتاتے ہوں کہ اس کا بولنا کوئی مثبت نتیجہ پیدا کرنے کا سبب نہیں بنے گا تو ایسی حالت میں آدمی کے اوپر ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ چپ رہے۔ ایسے موقع پر اس کا چپ رہنا ہی اس کے لیے باعثِ خیر ہے نہ کہ بولنا۔

اس دنیا میں خدا کی مدد اس کو ملتی ہے جو دنیا میں قائم کیے ہوئے خدائی قانون کی پابندی کرے۔ یہ دنیا خدا کے مقرر قوانین پر چل رہی ہے۔ یہ قوانین کبھی نہیں بدلتے۔ انسان کی کامیابی یہ ہے کہ وہ قانون فطرت سے ٹکرانے کے بجائے اس سے ہم آہنگی کا طریقہ اختیار کرے۔

دوسروں کے حقوق

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ شخص مومن نہیں جو خود سیر ہو کر کھائے اور اس کے پہلو میں اس کا پڑوسی بھوکا رہے (عن ابن عباس قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول لیس المومن بالذی یشبع وجارہ جائع الی جنبہ) البیہقی

جس انسان کے اندر اعلیٰ احساس زندہ ہو وہ کبھی اس کو پسند نہیں کرے گا کہ وہ خود تو فراغت کے ساتھ کھائے اور پیئے جب کہ اس کو معلوم ہو کہ اس کے قریب ایسے افراد موجود ہیں جو بھوک کے مسئلہ سے دو چار ہیں اور ان کے پاس اپنی بھوک مٹانے کے لیے کوئی سامان موجود نہیں۔

یہ ایک انسانی احساس ہے۔ اس کا تعلق محدود طور پر صرف کھانے پینے سے نہیں بلکہ ہر انسانی ضرورت سے ہے۔ سچے آدمی کی پہچان یہ ہے کہ جب بھی وہ کچھ انسانوں کو ضرورت کی حالت میں دیکھے تو وہ ان کے لیے تڑپ اٹھے۔ اس کو اس وقت تک چین نہ آئے جب تک کہ وہ ان کی ضرورت پوری نہ کر دے۔

اس ضرورت کا تعلق زندگی کے تمام پہلوؤں سے ہے۔ اگر آپ کا یہ حال ہو کہ آپ اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے تو بے حد فکرمند ہوں لیکن اپنے پڑوسیوں یا اپنے ہم وطنوں کو تعلیم یافتہ بنانے کا جذبہ آپ کے اندر نہ پایا جائے تو یہ بھی اسی کوتاہی میں شامل ہوگا۔ اسی طرح اگر آپ اپنے گھر والوں کی معاشیات کو درست کرنے کے لیے رات دن ایک کیے ہوئے ہوں لیکن دوسروں کی معاشیات کے بارے میں آپ کچھ نہ سوچیں تو آپ کی یہ روش بھی اسی حدیث کی مصداق قرار پائے گی۔

خدا کی جنت ایک لطیف اور نفیس کالونی ہے۔ اس میں وہی لوگ داخل کیے جائیں گے جو اپنے اندر آفاقی مزاج رکھتے تھے، جو تمام انسانوں کے درد کو اپنا درد بنائے ہوئے تھے۔

اسی طرح موجودہ دنیا میں کوئی اچھا انسانی سماج وہ لوگ بناتے ہیں جن میں یہ صفت ہو کہ وہ خود کھانے کے ساتھ دوسروں کو کھلائیں۔ وہ اپنے لیے سوچنے کے ساتھ دوسروں کے لیے بھی سوچیں۔ وہ اپنی ضرورتوں کی فراہمی کے ساتھ دوسروں کی ضرورت پوری کرنے کی تڑپ رکھتے ہوں۔ وہ انسانی سماج میں اس طرح رہیں جیسے کہ یہ سماج ایک وسیع کنبہ ہے اور وہ اس کنبہ کے ایک فرد۔

نجات کا ذریعہ

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کو یہ پسند ہو کہ خدا قیامت کی تکلیفوں سے اسے بچائے تو اس کو چاہیے کہ وہ قرض دار کو مہلت دے یا وہ اس کو معاف کردے (عن ابی قتادہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من سرّہ ان ینجیّہ اللہ من کُرَب یوم القیامۃ فلینفّس عن معسرٍ او یضع عنہ) مسلم

ایک آدمی اپنی ضرورت کے لیے کسی سے قرض لے اور جب ادائیگی کا مقرر وقت آئے تو وہ اس کی ادائیگی کی طاقت نہ رکھتا ہو، ایسی حالت میں قرض دینے والے کو چاہیے کہ وہ قرض دار کو مزید مہلت دے۔ اور اگر اس کے حالات کو دیکھتے ہوئے قرض دینے والا اپنے قرض کو معاف کردے تو اس کا یہ عمل خدا کو بہت پسند ہے۔ خدا ایسے بندوں کے ساتھ آخرت میں آسانی کا معاملہ فرمائے گا جو دنیا میں انسانوں کے ساتھ آسانی کا معاملہ کریں۔

اس اصول کا تعلق صرف قرض سے نہیں ہے بلکہ زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔ سماجی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کسی مشکل میں پھنس جاتا ہے اور دوسرا آدمی یہ قدرت رکھتا ہے کہ وہ اس کو اس مشکل سے نکالے اور اس کو راحت پہنچائے۔ ایسا ہر موقع آدمی کے لیے اس اعتبار سے نہایت قیمتی ہے کہ وہ اپنے بھائی پر مہربانی کرکے زیادہ بڑے پیمانے پر اپنے لیے خدا کی مہربانی حاصل کرلے۔

دوسرے کا بوجھ اتارنا اپنے انجام کے اعتبار سے اپنے بوجھ کو ہلکا کرنا ہے۔ دوسرے کے کام آنا آخرکار یہ فائدہ دیتا ہے کہ آدمی کا خود اپنا بگڑا ہوا کام بن جائے۔ جو آدمی دوسروں کی ضرورتیں پوری کرے خدا اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور زیادہ بڑے پیمانے پر اس کی ضرورتیں پوری کر دیتا ہے۔

کسی کو مشکل حالت میں دیکھ کر تڑپنا ایک اعتبار سے انسانیت کی بات ہے۔ جو شخص ایسا کرے اس نے گویا اپنے انسان ہونے کا ثبوت دیا۔ اسی کے ساتھ اس کا دوسرا اعظیم تر فائدہ یہ ہے کہ ایسا کرکے آدمی اپنے آپ کو خدا کی عنایت کا مستحق بنا لیتا ہے۔ یہ گویا دنیوی عمل کی اخروی قیمت ہے اور بلاشبہ کسی انسان کے لیے اس سے بڑی اور کوئی سعادت نہیں۔

پابند زندگی

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— مومن کی مثال اور ایمان کی مثال ایسی ہے جیسے کھونٹی کی رسّی سے بندھا ہوا گھوڑا، وہ گھومتا ہے اور پھر اپنی کھونٹی کی طرف واپس آجاتا ہے (مثلُ المومن ومثل الایمان کمثل الفرس فی آخیّتہٖ یجولُ ثم یرجع الیٰ آخیّتہٖ) البیہقی بحوالہ مشکاۃ المصابیح ۲/۱۲۲۶

انسان کو دنیا کی زندگی میں کھلے ہوئے گھوڑے کی طرح نہیں رہنا ہے بلکہ بندھے ہوئے گھوڑے کی طرح رہنا ہے۔ انسان کی کامیابی یہ ہے کہ وہ اپنی آزادی کو مقرر اصولوں کا پابند بنائے۔ وہ ایک بااصول انسان کی زندگی گزارے نہ کہ بے اصول انسان کی زندگی۔

یہ بااصول زندگی کیا ہے، وہ یہ ہے کہ آدمی حرام اور حلال میں تمیز کرے۔ خدا نے جن چیزوں کی اجازت دی ہے ان کو استعمال کرے اور خدا نے جن چیزوں سے روکا ہے ان سے وہ اپنے آپ کو روکے رہے۔

انسان کو چاہیے کہ وہ تعمیری انداز میں سوچے اور تخریبی سوچ سے ہر حال میں اپنے آپ کو باز رکھے۔ وہ اپنی زبان سے صرف درست بات نکالے اور جہاں غلط بات کا موقع ہو وہاں وہ اپنی زبان کو بند کر لے۔ لوگوں سے معاملہ کرنے میں وہ انصاف کے اصولوں کی پابندی کرے، وہ کبھی لوگوں کے ساتھ بے انصافی کا معاملہ نہ کرے، لوگوں کے درمیان اس کا سلوک ذمہ دارانہ سلوک ہو، غیر سنجیدگی اور غیر ذمہ داری کی روش کو وہ ہمیشہ کے لیے ترک کر دے۔

گھوڑے کو مادی رسّی باندھتی ہے۔ مگر انسان کو جو چیز باندھتی ہے وہ خدا کے مقرر کیے ہوئے اخلاق اور انسانی اصول ہیں۔ گھوڑا مجبور ہوتا ہے کہ وہ رسی کے دائرہ سے باہر نہ جائے۔ یہی کام انسان خود عائد کی ہوئی پابندی کے تحت کرتا ہے۔ انسان کی عظمت یہ ہے کہ وہ اپنی رسّی آپ بن جائے۔ وہ اس پابند زندگی کو آزادانہ طور پر اختیار کر لے جس کو ایک گھوڑا مجبورانہ طور پر اختیار کیے ہوئے ہے۔

ناکام وہ ہے جو آزادی پاکر بے قید ہو جائے اور کامیاب وہ ہے جو آزادی کے باوجود پابند زندگی گزارے۔

نرم روش

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— مومن کی مثال ایک زرعی پودے جیسی ہے جس کو ہوائیں ہلاتی رہتی ہیں۔ ایک جھونکا اس کو زمین پر گرا دیتا ہے اور دوسرا جھونکا اس کو سیدھا کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا آخری وقت آجائے (مثل المومن کمثل الخامة من الزرع تُفیّئها الریاح، تصرعها مرّةً وتُعدِلها اخری، حتی یاتیه اجله) متفق علیہ بحوالہ مشکاۃ المصابیح ۱/ ۴۸۷

خدا پرست انسان اکڑ والا انسان نہیں ہوتا، بلکہ وہ ایک نرم انسان ہوتا ہے۔ اپنی فکر اور عقیدہ پر کامل یقین رکھنے کے باوجود، عملی زندگی میں اس کا رویہ ہمیشہ نرمی والا ہوتا ہے نہ کہ سختی والا۔

سماجی زندگی میں کوئی آدمی اپنے عقیدہ میں تو بے لچک ہو سکتا ہے مگر لوگوں کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے بے لچک بننا اس کے لیے ممکن نہیں۔ عقیدہ ایک ذاتی معاملہ ہے اور وہ حقیقتِ واقعہ سے مطابقت کے تحت بنتا ہے مگر عملی روش میں لوگوں کے ساتھ رعایت کرنا ضروری ہے۔ لوگوں کی رعایت کیے بغیر عملی زندگی کا کوئی ڈھانچہ بننا ممکن نہیں۔

عملی زندگی میں کوئی شخص اکڑ کی روش کیوں اختیار کرتا ہے، یہ ہمیشہ انانیت کی بنا پر ہوتا ہے۔ جب بھی کسی سے اختلاف کی صورت پیش آتی ہے تو آدمی فوراً اس کو اپنے لیے غیرت کا مسئلہ بنا لیتا ہے۔ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ اگر میں نے اس معاملہ میں لچک دکھائی تو میں فریق ثانی کے مقابلہ میں چھوٹا بن جاؤں گا۔ یہی احساس اس کو لچک دار رویہ اختیار کرنے سے روک دیتا ہے۔ وہ اپنے موقف کو اصولی موقف قرار دے کر اس پر جم جاتا ہے۔ حالانکہ ایسے موقع پر اصولی موقف یہ ہے کہ معاملہ کو غیرت کا سوال نہ بنایا جائے، بلکہ نرمی اور لچک کا انداز اختیار کرتے ہوئے معاملہ کو حل کیا جائے۔

خدائی عقیدہ کے تحت جو انسان بنتا ہے اس کا احساس یہ ہوتا ہے کہ ساری بڑائی خدا کے لیے ہے۔ میں اس کا صرف بندہ ہوں اور میرے پاس عجز کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ احساس خدا پرست انسان کو ایک نرم انسان بنا دیتا ہے۔ جس کا اظہار لوگوں کے درمیان مختلف صورتوں میں ہوتا رہتا ہے۔

نرمی اور رعایت کا طریقہ ایک خدائی طریقہ ہے۔ اس کے برعکس شدت اور کڑے پن کا طریقہ سراسر غیر خدائی طریقہ۔

یکساں انسان

حدیث میں آیا ہے کہ ـــــ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں ایک مقام پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس دوران وہاں سے ایک جنازہ گزرا، آپ (اس کے احترام میں) کھڑے ہو گئے۔ آپ سے کہا گیا کہ یہ ایک یہودی کا جنازہ ہے۔ آپ نے فرمایا۔ کیا وہ انسان نہ تھا (الیست نفساً) فتح الباری ۳/۲۱۴

خدا پرستانہ زندگی کا اصول یہ ہے کہ ہر انسان کو عزت اور احترام کی نظر سے دیکھا جائے، خواہ وہ ایک مذہب سے تعلق رکھتا ہو یا دوسرے مذہب سے۔ خواہ وہ اپنی قوم کا آدمی ہو یا غیر قوم کا آدمی۔ احترام کا تعلق اس حقیقت واقعہ سے ہے کہ خدا نے جس طرح مجھ کو پیدا کیا ہے اسی طرح اس نے دوسرے انسانوں کو بھی پیدا کیا ہے۔ ایک انسان خواہ وہ کوئی بھی مذہب یا کلچر اختیار کر لے اس کی انسانی حیثیت بہرحال باقی رہتی ہے۔ اور اس مشترک حیثیت کی بنا پر وہ تمام لوگوں کے لیے بدستور قابل احترام بنا رہتا ہے۔

جب آپ کسی آدمی کو دیکھیں اور آپ کی نظر اس کے اختلافی پہلو پر چلی جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ اس کے بارے میں نفرت اور توحش میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اس کے برعکس اگر ایسا ہو کہ آپ اس کو اس نظر سے دیکھیں کہ وہ ایک انسان ہے۔ وہ خدا کا ایک تخلیقی شاہکار ہے۔ اس کا موجوداتی وجود خدا کی اعلیٰ صفات کی یاد دلاتا ہے۔ تو ایسی حالت میں آپ ظاہری اختلافات کو بھول کر خدا کی خدائی میں گم ہو جائیں گے۔

اب مخلوق کے آئینہ میں آپ کو خالق دکھائی دینے لگے گا۔ انسان کی صورت میں آپ ایک ایسی ہستی کا تصور کرنے لگیں گے جو آپ ہی کی طرح خدا کی پیدا کی ہوئی ہے جو اتنا ہی محترم ہے جتنا آپ خود اپنے کو محترم سمجھتے ہیں۔ جس کا تعلق خدا کے ساتھ اتنا ہی ہے جتنا خود آپ کا تعلق خدائے رحمٰن ورحیم کے ساتھ ہے۔

کسی انسان کا احترام انسان کے لیے نہیں ہوتا بلکہ خدا کے لیے ہوتا ہے۔ مومن جب کسی انسان کا احترام کرتا ہے تو یہ اس کی طرف سے دراصل اس کے خدائی احساسات کا اظہار ہوتا ہے۔ اور خدائی احساسات کے اظہار کی کوئی حد نہیں۔ اس کا تعلق کانٹے سے بھی اتنا ہی ہے جتنا پھول سے، وہ ایک انسان کے معاملہ میں بھی اسی طرح ظاہر ہوتا ہے جس طرح کسی دوسرے انسان کے معاملہ میں۔

تربیت گاہ

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : خیرکم خیرکم لاھلہ (مشکوٰۃ المصابیح ۲/۳۲۵۱) تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہو۔ یعنی جو آدمی اپنے گھر کے لوگوں سے معاملہ کرنے میں بہتر ہو گا وہی باہر والوں سے معاملہ کرنے میں بھی بہتر ثابت ہو گا۔

گھر ہر آدمی کی فطری تربیت گاہ ہے۔ گھر کے اندر محدود سطح پر وہ سارے معاملات پیش آتے ہیں جو باہر سماج کے اندر زیادہ وسیع طور پر پیش آتے ہیں۔ اس لیے جو آدمی محدود دائرہ میں بہتر انسانیت کا ثبوت دے گا، وہ باہر کے وسیع تر دائرہ میں بھی بہتر انسانیت والا بن کر رہ سکے گا۔

ایک صاحب گورنمنٹ سروس میں تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ بیوی کو دبا کر رکھنا چاہیے۔ گھر کے اندر وہ روزانہ اپنے اسی نظریہ پر عمل کرتے۔ وہ ہمیشہ گھر کی خاتون کے ساتھ سخت انداز میں بولتے۔ وہ ان کے ساتھ شدت والا سلوک کرتے۔ تاکہ وہ ان کے مقابلہ میں دب کر رہیں۔

گھر کی تربیت گاہ میں ان کا جو مزاج بنا اسی کو لے کر وہ دفتر میں پہنچے۔ یہاں ان کی افسر (باس) اتفاق سے ایک خاتون تھیں۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہاں بھی ان کا وہی گھر والا مزاج قائم رہا۔ وہ اپنی افسر خاتون کے ساتھ بھی اسی قسم کا "مردانہ" معاملہ کرنے لگے جس کے عادی وہ اپنے گھر کی خاتون کے ساتھ ہو چکے تھے۔

لیڈی افسر ابتداءً ان کے ساتھ ٹھیک تھی۔ مگر ان کے غیر معتدل انداز نے لیڈی افسر کو بھی ان سے برہم کر دیا۔ اس نے بگڑ کر ان کا ریکارڈ خراب کر دیا۔ ان کا پروموشن رک گیا۔ وہ طرح طرح کی دفتری مشکلات میں پھنس گئے۔

صحیح اصول وہ ہے جو گھر کے اندر اور گھر کے باہر دونوں جگہ یکساں طور پر مفید ہو۔ یہ اصول شرافت کا اصول ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ گھر کے اندر شرافت کے ساتھ رہے۔ وہ بڑوں کو عزت دے اور چھوٹوں کے ساتھ مہربانی کا سلوک کرے۔ یہ اصول گھر کے اندر بھی کامیاب ہے اور گھر کے باہر بھی۔ یہ آدمی کی اپنی ضرورت ہے کہ وہ گھر کے اندر اعتدال کے ساتھ رہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو باہر کی دنیا میں بھی لوگوں کے ساتھ اس کا سلوک غیر معتدل ہو جائے گا۔

ناقابل معافی جرم

سنن ابی داؤد میں یہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ خدا نے فرمایا: کبر میری چادر ہے، اور عظمت میری اِزار ہے، پس ان دونوں میں سے کسی میں جو شخص مجھ سے نزاع کرے گا میں اس کو آگ میں پھینک دوں گا (الکبریاءُ ردائی، والعظمۃ اِزاری، فمن نازعنی واحداً منہما قذفتُہ فی النار) کتاب اللباس ۴/۵۸

اس حدیث میں تمثیل کی زبان میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہر قسم کی بڑائی اور ہر قسم کی برتری صرف ایک خدا کا حق ہے۔ جو شخص اس معاملہ میں کلی یا جزئی طور پر خدا کا ہمسر بننا چاہے وہ نہ صرف دنیا میں ذلیل ہوگا بلکہ آخرت میں اس کو شدید تر عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔

مثال کے طور پر خدا کی عظمت و کبریائی کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہی عزت دینے والا ہے اور وہی ذلت دینے والا۔ وہی کسی کو رزق دیتا ہے اور کسی کو رزق سے محروم کر دیتا ہے۔ اس کے سوا کسی کو یہ طاقت نہیں کہ کسی کو کچھ دے یا اس سے کوئی چیز چھین لے۔

مثلاً ایک شخص کو کسی آدمی پر غصہ آگیا۔ یہ غصہ انتقام تک پہنچ گیا۔ یہاں تک کہ وہ اس کے درپے ہوگیا کہ مذکورہ آدمی کو بے عزت کرے، اس کے رزق کا ذریعہ اس سے چھین لے۔ وہ اس کو اس کے ماحول میں بے جگہ بنا دے۔ کسی شخص کی طرف سے اس قسم کی تخریبی کوشش خدا کی عظمت و کبریائی سے گویا نزاع کرنا ہے۔ یہ نعوذ باللہ خدا کے اختیارات کو اس سے چھیننے کی جسارت کرنا ہے۔

اس قسم کا فعل حد درجہ سنگین ہے۔ جو شخص ایسا کرنے کی کوشش کرے وہ بظاہر اپنے حریف کے ساتھ یہ فعل کر رہا ہوتا ہے۔ مگر حدیث کی زبان میں وہ براہ راست خدا سے نزاع کر رہا ہے۔ وہ خدا کے اس نظام میں دخل دینے کی کوشش کر رہا ہے جس میں خدا نے کسی دوسرے کو شریک نہیں کیا۔ یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے خدا کی خدائی میں شریک ہونے کی کوشش کرنا ہے۔ اور خدا کی خدائی میں شریک بننے کی کوشش بلاشبہہ ایک ایسا جرم ہے جو ہرگز قابل معافی نہیں۔

انسان کی بڑائی کبر میں نہیں ہے بلکہ تواضع میں ہے۔ انسانیت کی تمام ترقیاں متواضع انسان کے لیے مقدر ہیں نہ کہ متکبر انسان کے لیے۔

لایعنی سے پرہیز

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— آدمی کے اسلام کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ ان کاموں کو چھوڑ دے جن میں کوئی فائدہ نہیں (من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ) ادب الدنیا والدین للبصری صفحہ ۸۳ -

سچا انسان ایک بامقصد انسان ہوتا ہے۔ اس کی ساری توجہ ایک متعین مقصد کی طرف لگی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ مقصدیت اس کے اندر یکسوئی پیدا کر دیتی ہے۔ وہ اس کام میں مشغول ہوتا ہے جس کا اس کے مقصد سے واضح تعلق ہو اور جو چیز اس کے مقصد کے اعتبار سے غیر متعلق ہو اس سے وہ اپنے آپ کو دور کر لیتا ہے۔

ایسا آدمی ضروری اور غیر ضروری میں فرق کرتا ہے۔ کسی کام کو کرنے سے پہلے وہ دیکھتا ہے کہ یہ کام اس کے مقصد کے اعتبار سے کس حد تک ضروری ہے۔ وہ جب بولتا ہے تو بولنے سے پہلے سوچتا ہے کہ اس کا بولنا کسی حقیقی ضرورت کو پورا کرنے والا ہے یا وہ ایک بے فائدہ کلام کی حیثیت رکھتا ہے۔ حتی کہ اپنے مقصد کے بارے میں اس کی حساسیت اس کو مجبور کر دیتی ہے کہ وہ اپنی سوچ کے اوپر بھی نگراں بن جائے۔ وہ اپنے دماغ کو ایسی باتیں سوچنے میں استعمال نہ کرے جس کا کوئی مثبت فائدہ اس کو یا انسانیت کو ملنے والا نہیں۔

بے مقصد انسان اور بامقصد انسان کا فرق یہ ہے کہ بامقصد انسان سوچی سمجھی زندگی گزارتا ہے اور بے مقصد انسان کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس کے سامنے کوئی واضح نشانہ نہیں ہوتا۔ وہ کسی منزل کے بغیر اپنی زندگی کے دن گزارتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اسی حال میں مر جاتا ہے۔

سچا انسان وہ ہے جو با اصول انسان ہو۔ ایسے انسان کی سرگرمیاں اصول کے تحت ہوتی ہیں نہ کہ محض ذاتی خواہش کے تحت۔ ایسا انسان اپنی ذاتی خواہش کو الگ رکھ کر چیزوں کو ان کی اصل حقیقت کے اعتبار سے دیکھتا ہے۔ ایسے انسان کا حال فطری طور پر یہ ہوتا ہے کہ وہ صرف انہی چیزوں کو لیتا ہے جن کی کوئی اصولی اہمیت ہو اور جو چیزیں اصول کے اعتبار سے غیر اہم ہوں ان کو وہ چھوڑ دیتا ہے، خواہ بظاہر وہ کتنی ہی بارونق دکھائی دیتی ہوں۔

اچھا انسان، برا انسان

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ — کیا میں تم کو بتاؤں کہ تم میں سب سے زیادہ برے لوگ کون ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ ہاں اے خدا کے رسولؐ۔ آپ نے فرمایا۔ تم میں سب سے زیادہ برے وہ ہیں جو چغلی کرتے پھریں، جو دوستوں کے درمیان بگاڑ ڈالیں۔ جو لوگوں کے عیوب تلاش کریں (عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال: الا اخبرکم بشرارکم، قالوا بلیٰ یا رسول اللہ، قال: من شرارکم المشاؤون بالنمیمۃ، المفسدون بین الاحبۃ الباغون العیوب) ادب الدنیا والدین للبصری صفحہ ۲۲۲

فطرت کے نقشہ میں ہر انسانی کردار کی مثالیں موجود ہیں۔ یہ مثالیں اس لیے ہیں کہ انسان ان پر غور کرے، وہ ان سے نصیحت لے۔ اور پھر وہ اچھے کردار کو اپنائے اور جو برا کردار ہے اس سے دور رہے۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ دنیا میں دو قسم کی مکھیاں ہوتی ہیں۔ ایک شہد کی مکھی، جو ہمیشہ خوشبو اور مٹھاس کی تلاش میں ہوتی ہے۔ وہ جس پھول میں خوشبو اور مٹھاس دیکھتی ہے فوراً اڑ کر وہاں پہنچ جاتی ہے۔ اس طرح وہ پھولوں کی مٹھاس لے کر اسے جمع کرتی ہے تاکہ وہ اسے دوسرے انسانوں تک پہنچا سکے۔ دوسری مثال عام مکھی کی ہے۔ اس کو گندگی سے دلچسپی ہوتی ہے۔ وہ ہر وقت اڑتی رہتی ہے۔ صرف اس لیے کہ جہاں وہ گندگی پائے وہاں پہنچ کر اس سے اپنا حصہ وصول کرے۔

اسی طرح انسانوں کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ انسان جو بھلائی کو پسند کرتا ہو۔ وہ لوگوں کے درمیان جائے تو ان سے ان کی بھلی باتوں کو لے اور اسے دوسروں تک پہنچائے۔ وہ لوگوں کے درمیان اچھی اور بھلی باتوں کا سفیر بن جائے۔ یہی وہ انسان ہے جس کو بہتر انسان کہا جائے۔ ایسا انسان فطرت کا مطلوب انسان ہے۔ فطرت کے تمام اعلیٰ امکانات ایسے ہی لوگوں کے لیے مقدر کیے گئے ہیں۔

دوسرا انسان وہ ہے جس کی روح کو برائیوں کے تذکرہ سے غذا ملتی ہو۔ ایسا انسان جب لوگوں سے ملتا ہے تو اس کی ساری دلچسپی یہ ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی برائیوں کو تلاش کرے اور اگر کوئی برائی نہ ملے تو فرضی طور پر خود ساختہ برائیوں کو ان کی طرف منسوب کر دے، اور پھر ان فرضی یا واقعی برائیوں کو لوگوں سے بیان کرتا رہے۔

فخــــر و ناز

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فخر و ناز نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو (ان العُجبَ لیأکل الحسنات کما تأکل النارُ الحطبَ) ادب الدنیا و الدین للبصری صفحہ ۱۱۳

انسان کے اندر فطری طور پر اَنا کا جذبہ رکھا گیا ہے، کوئی بھی شخص "میں" کے اس احساس سے خالی نہیں۔ یہ جذبہ انسان کے لیے ایک قیمتی سرمایہ ہے، وہ اس لیے ہے کہ آدمی کے اندر عزم و ہمت پیدا ہو۔ وہ جوکھم کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے سفر کو جاری رکھے۔ وہ خود اعتمادی کی طاقت سے مسلسل آگے بڑھتا رہے۔

مگر اکثر لوگ اس جذبہ کا برا استعمال کرتے ہیں۔ ان کا اَنا کا جذبہ خود اعتمادی کے بجائے خود پسندی اور ذاتی فخر کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ انا کے جذبہ کا غلط استعمال ہے۔ اور کسی چیز کا غلط استعمال ہمیشہ اس کو برا بنا دیتا ہے، خواہ حقیقت کے اعتبار سے وہ چیز کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو۔

فخر و ناز کا جذبہ کوئی سادہ چیز نہیں۔ وہ انسان کی تمام خوبیوں کو کھا جاتا ہے، وہ انسان کے اندر اعلیٰ خصوصیات کے ارتقاء میں ایک مستقل رکاوٹ ہے۔ فخر کی نفسیات آدمی کو خود پسند بنا دیتی ہے، اور جو آدمی خود پسند ہو جائے اس نے گویا اپنے آپ کو ذاتی خول میں بند کر لیا۔ ایسا آدمی اس صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے کہ وہ خارجی حقیقتوں کو سمجھے، وہ دوسروں سے فائدہ اٹھائے، وہ اپنے سے باہر کی چیزوں کو اپنی ترقی کا زینہ بنا سکے۔

ایسا آدمی کوئی نیکی کا کام کرتا ہے تو اس میں بھی اس کا فخر کا جذبہ شامل رہتا ہے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے خود نمائی کے لیے کرتا ہے۔ اس کی سرگرمیوں کا محور اس کی اپنی ذات بن جاتی ہے، حالانکہ صحیح یہ ہے کہ آدمی کی سرگرمیوں کا محور وہ حقیقت ہو جو اس کے باہر اعلیٰ سطح پر قائم ہے۔

فطرت انسان کے اندر تواضع دیکھنا چاہتی ہے۔ لیکن فخر پسند آدمی کبر کی تصویر بنا ہوا ہوتا ہے۔ فطرت حقیقتوں کے اعتراف کو پسند کرتی ہے۔ مگر ایسا آدمی بے اعترافی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ فطرت تمام انسانوں کو ایک نظر سے دیکھتی ہے اور ایسا آدمی چاہتا ہے کہ اس کو استثنائی مقام دیا جائے۔ فطرت کے ساتھ اس قسم کی عدم مطابقت موجودہ دنیا میں قابل عمل نہیں۔

پڑوسی کا حق

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ــــ خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے، خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے، خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے۔ لوگوں نے کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، کون۔ آپ نے فرمایا کہ وہ شخص جس کا پڑوسی اس کی زیادتیوں سے امن میں نہ ہو (قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واللہ لا یومن، واللہ لا یومن، واللہ لا یومن، قیل من یا رسول اللہ؟ قال الذی لا یأمن جارہ بوائقہ) بخاری، کتاب الادب۔ مسلم، کتاب الایمان۔

انسان ایک سماجی مخلوق ہے۔ وہ جہاں بھی رہتا ہے ایک سماج کے اندر رہتا ہے۔ حتی کہ آدمی جب سفر کرتا ہے اس وقت بھی کچھ لوگ اس کے ساتھی بن جاتے ہیں۔ یہ تمام لوگ انسان کے پڑوسی ہیں۔

اب ایک انسان وہ ہے جو لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے ان کی پوری طرح رعایت کر رہا ہو۔ وہ ایسی بات نہ کہے جس سے لوگوں کے جذبات بھڑکیں۔ وہ ایسا کام نہ کرے جو اس کے قریبی لوگوں کے لیے مسئلہ پیدا کرنے والا ہو، وہ اپنی زندگی کے لیے سرگرم ہو مگر اس طرح کہ اس کی سرگرمی دوسروں کے لیے نقصان یا پریشانی کا سبب نہ بنے۔ یہ وہ انسان ہے جس نے اپنے پڑوسی کا حق ادا کیا۔

دوسرا انسان وہ ہے جو صرف اپنی رعایت کرنا جانتا ہو، دوسروں کی رعایت سے اسے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ ایسا انسان دوسروں کے لیے مستقل مسئلہ بنا رہے گا۔ وہ اپنے غیر محتاط بول سے دوسروں کے جذبات کو ٹھیس پہنچائے گا۔ وہ ایسی کارروائیاں کرے گا جو دوسروں کا امن وسکون چھین لینے والی ہوں، وہ جب اپنا کوئی مقصد حاصل کرنا چاہے گا تو اس کے لیے وہ ایسی غیر ذمہ دارانہ کارروائیاں کرے گا جو دوسروں کی زندگی میں خلل ڈالنے والی ہوں۔ ایسا انسان اپنے قریبی لوگوں کے لیے برا پڑوسی ہے۔

جو آدمی اپنے پڑوسی کے لیے اچھا ہو، وہی اچھا انسان ہے، اور جو آدمی اپنے پڑوسیوں کے لیے برا ہو وہی برا انسان۔ اپنے فائدہ کے لیے دوسرے کو نقصان پہنچانا بلاشبہ ایک جرم ہے اور کون شخص اس جرم کا مجرم ہے، اس کو جاننے کا سب سے زیادہ یقینی ذریعہ اس آدمی کا پڑوس ہے۔ پڑوسی انسان گویا خدا کی عدالت ہے۔ جس انسان کے بارہ میں اس کے پڑوسی اچھی رائے رکھیں وہ اچھا انسان ہے اور جس انسان کو اس کے پڑوسی برا سمجھیں وہ بلاشبہ برا انسان۔

اخلاقی کنٹرول

ابومسعود البدری ایک صحابی ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ ایک بار وہ اپنے غلام کو کوڑے سے مار رہے تھے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت وہاں آ گئے۔ آپ نے یہ دیکھ کر کہا کہ اے ابومسعود جان لو کہ اللہ تمہارے اوپر اس سے زیادہ قدرت رکھتا ہے جتنا تم اس غلام پر قدرت رکھتے ہو۔ یہ سن کر ابومسعود کے ہاتھ سے کوڑا گر گیا۔ انھوں نے کہا کہ آئندہ میں کبھی کسی غلام کو نہیں ماروں گا۔ اس کے بعد انھوں نے غلام کو آزاد کر دیا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم ایسا نہ کرتے تو آگ تم کو پکڑ لیتی (صحیح مسلم بحوالہ ریاض الصالحین، صفحہ ۳۹۸)

دنیا میں ظلم و زیادتی کی جتنی صورتیں ہیں ان سب کی وجہ صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ ایک انسان کا سابقہ جب کسی دوسرے انسان سے پیش آتا ہے تو وہ اس کو صرف ایک انسانی معاملہ سمجھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ بس ایک انسان ہے اور اگر میں اس کے ساتھ ظلم یا بے انصافی کروں تو اس کے آگے کہیں میری پکڑ ہونے والی نہیں۔

مگر اصل حقیقت یہ ہے کہ تمام انسانوں کے اوپر ایک برتر طاقت ہے اور وہ خدا ہے۔ خدا ہر انسان کی نگرانی کر رہا ہے۔ جو شخص کسی دوسرے کو ناحق ستائے یا اس کے ساتھ بے انصافی کرے تو خدا ایسے شخص کو پکڑے گا اور اس کو اس کے فعل کی سخت سزا دے گا۔

خدائی پکڑ کا یہ احساس کسی انسان کے لیے سب سے بڑا روک ہے۔ وہ انسان کو بتاتا ہے کہ جس معاملہ کو تم صرف ایک انسانی معاملہ سمجھ رہے ہو وہ حقیقۃً ایک خدائی معاملہ ہے۔ کسی انسان کے مقابلہ میں تم طاقت ور ہو سکتے ہو، مگر خدا کے مقابلہ میں کوئی بھی طاقت ور نہیں۔ خدا کی پکڑ جب ظاہر ہوگی تو نہ کوئی طاقت والا اس کی زد سے بچے گا اور نہ کوئی بے طاقت والا۔

مذکورہ عقیدہ آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اخلاقی کنٹرول میں رکھے۔ وہ اپنی آزادی کو کسی بھی حال میں غلط طور پر استعمال نہ کرے۔ اگر آپ کو اس حقیقت کا یقین ہو جائے تو کوئی انسان آپ کو کمزور نہیں دکھائی دے گا جس کو آپ دبائیں، اور نہ کوئی انسان آپ کو بے یار و مددگار نظر آئے گا جس کے اوپر اپنی ظالمانہ کارروائیوں کے لیے آپ دلیر ہو جائیں۔

غصہ نہیں

حدیث میں ہے کہ ایک شخص پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ اے خدا کے رسولؐ مجھے کچھ ایسی باتیں بتائیے جن کے تحت میں زندگی گزاروں اور وہ زیادہ نہ ہوں کہ میں بھول جاؤں۔ آپؐ نے فرمایا کہ تم غصہ نہ کرو (عَنْ حُمَیْدِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ اَنَّ رَجُلاً اَتٰی اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ عَلِّمْنِیْ کَلِمَاتٍ اَعِیْشُ بِھِنَّ وَلَا تُکْثِرْ عَلَیَّ فَاَنْسٰی، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ "لَا تَغْضَبْ") موطا امام مالک، صفحہ ۶۵۲

غصہ تمام انسانی خرابیوں کی جڑ ہے۔ جو آدمی اپنے غصہ پر قابو پالے وہ بقیہ تمام خرابیوں سے اپنے آپ بچ جائے گا۔ کسی آدمی کو اگر صرف ایک جامع اور کلیدی نصیحت کرنی ہو تو وہ صرف یہ ہوگی ——— اپنے آپ کو غصہ سے بچاؤ۔

غصہ کا مزاج ہر انسان میں ہوتا ہے۔ مگر عام حالات میں غصہ آدمی کے اندر سویا ہوا ہوتا ہے۔ یہ غصہ صرف اس وقت جاگتا ہے جبکہ کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آکر اس کو جگا دے۔

دنیا کی زندگی میں یہی آدمی کا امتحان ہے جب وہ کسی کی زبان سے کڑوی بات سنے اور اس کے سینہ میں غصہ کی آگ بھڑک اٹھے تو آدمی کا کام یہ ہونا چاہیے کہ وہ غصہ کی آگ کو بجھائے نہ یہ کہ غصہ کی آگ کو اتنا بھڑکائے کہ خود بھی اس میں جل کر ختم ہو جائے۔

کامیاب انسان وہ ہے جس کا یہ حال ہو کہ غصہ کے حالات میں بھی وہ غصہ نہ کرے۔ اشتعال انگیزی کے باوجود وہ مشتعل نہ ہو۔ ایسا آدمی معاملہ کو بڑھائے بغیر ابتدائی مرحلہ ہی میں اس کو ختم کر دے گا۔ غصہ نہ کرنے کی عادت کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ آدمی اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو بے فائدہ طور پر ضائع ہونے سے بچا لیتا ہے۔ وہ ناموافق حالات میں بھی اپنے لیے موافق امکانات دریافت کر لیتا ہے۔

غصہ نہ کرنا عالی ظرفی کی علامت ہے۔ اس کے مقابلہ میں جو آدمی غصہ کرے وہ اپنے اس عمل سے اس بات کا ثبوت دے رہا ہے کہ ظرف کی بلندی کی صفت اس کے اندر موجود نہیں۔

انسان کو ستانا

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ — تم لوگ خدا کے بندوں کو تکلیف نہ دو، اور ان کو عار نہ دلاؤ۔ اور ان کی پوشیدہ باتوں کو تلاش نہ کرو (لاتؤذوا عباد اللہ ولاتعیّروھم ولا تطلبوا عوراتھم) مسند احمد بحوالہ جامع العلوم والحکم، صفحہ ۲۹۴

اچھا انسانی سماج بنانے کے لیے ضروری ہے کہ لوگوں کے اندر اخلاقی احساس زندہ ہو۔ وہ دوسروں کی رعایت کرنا جانتے ہوں، وہ اپنے اوپر دوسروں کا یہ حق سمجھتے ہوں کہ انھیں دوسروں کے لیے ہرگز مسئلہ نہیں بننا ہے، حتی کہ اس وقت بھی نہیں جب کہ ان کے پاس بظاہر اس کے لیے کوئی عذر موجود ہو۔

ہر آدمی کو چاہیے کہ وہ سماج کے اندر اس طرح رہے کہ اس سے کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ اس کو اپنی زبان سے ایسے الفاظ نہیں نکالنے چاہئیں جس سے دوسروں کے جذبات مجروح ہونے والے ہوں۔ اس کو ایسی کوئی کارروائی نہیں کرنی چاہیے جس میں اس کی اپنی ذات کے لیے تو فائدہ ہو مگر دوسروں کے لیے وہ نقصان کا سبب بن جائے۔ ایسا ہر قول اور عمل گویا دوسروں کو ستانا ہے اور جو آدمی دوسرے انسانوں کو ستائے وہ ایک بے قیمت آدمی ہے خدا کی نظر میں بھی اور بندوں کی نظر میں بھی۔

آدمی کے ساتھ کبھی ایسا واقعہ پیش آتا ہے یا اس سے کوئی ایسی غلطی ہو جاتی ہے جس کے بارہ میں اس کو شرمندگی کا احساس ہوتا ہے۔ ایسی بات کا تذکرہ کرکے اس کو عار دلانا درست نہیں۔ تم وہی تو ہو جس نے ایسا کیا یا جس کے باپ نے ایسا کیا، اس قسم کی باتیں کہہ کر کسی کو شرمندہ کرنا ایک غیر انسانی فعل ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ دوسرے کی عزت و حرمت کا بھی اتنا ہی لحاظ کرے جتنا وہ خود اپنی عزت و حرمت کا لحاظ کرتا ہے۔ ہر آدمی کی کچھ ایسی باتیں ہوتی ہیں، جن کو وہ پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ دوسرے لوگ اسے جانیں۔ جو شخص لوگوں کی ایسی باتوں کے پیچھے پڑے، وہ کھود کرید کر ان کا پتہ لگائے اور لوگوں کے درمیان ان کو پھیلائے، وہ ایک ایسا غیر اخلاقی فعل کرتا ہے جو اچھا سماج بنانے کی راہ میں مستقل رکاوٹ ہے۔

زبان کا استعمال

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ـــــ سب سے بڑے گناہ گار وہ لوگ ہیں جو بہت زیادہ بے فائدہ باتیں کریں (اکثر الناس ذنوبا اکثرھم کلاما فیما لایعنیہ) جامع العلوم والحکم، صفحہ ۹۹

انسان کو جو قیمتی چیزیں دی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک نہایت قیمتی چیز زبان ہے۔ زبان کے ذریعہ آدمی بولتا ہے۔ اس کے ذریعہ وہ دوسروں سے تبادلہ خیال کرتا ہے۔ زبان دوسروں سے تعلق قائم کرنے کا سب سے زیادہ اہم ذریعہ ہے۔ اس اعتبار سے زبان ایک ایسی نعمت ہے جو اس دنیا میں انسان کے سوا کسی اور کو نہیں دی گئی۔

زبان کو اگر بقدر ضرورت استعمال کیا جائے تو اس میں انسان کے لیے نہایت عظیم فائدے ہیں۔ لیکن اگر زبان کو غیر ضروری کاموں میں استعمال کیا جانے لگے تو یہ انتہائی مفید چیز انسان کے لیے ایک انتہائی مضر چیز بن جائے گی۔

زیادہ بولنے کا مطلب دوسرے لفظوں میں کم سوچنا ہے۔ جو آدمی ہر وقت بولتا رہے وہ اس سے محروم ہو جائے گا کہ وہ دوسروں کی باتیں سنے اور اس سے اپنی معلومات میں اضافہ کرے۔ زیادہ بولنا ہمیشہ اس قیمت پر ہوتا ہے کہ آدمی کے اندر علم و فکر کی صلاحیت ترقی نہ کر سکے۔

یہ زبان کے بے ضرورت استعمال کا نتیجہ تھا۔ لیکن جب زبان کو غلط طور پر استعمال کیا جانے لگے تو اس کا نقصان اتنا زیادہ بڑھ جاتا ہے کہ اس کا حساب لگانا ممکن نہیں۔

زبان کا غلط استعمال یہ ہے کہ آدمی اس کو دوسروں کی برائی کرنے میں استعمال کرے۔ وہ افواہوں کو پھیلائے اور غلط معلومات کے ذریعہ لوگوں کو گمراہ کرے۔ وہ زبان کے ذریعہ ایسی باتیں کرے جس سے لوگوں کے اندر ایک دوسرے کے خلاف بے اعتمادی پیدا ہو۔ لوگ ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگیں، لوگ ایک دوسرے کے خلاف غیر ضروری شک میں مبتلا ہو جائیں۔

بے فائدہ کلام اگر زبان کی نعمت کی ناقدری ہے تو غلط کلام زبان کی نعمت کا برا استعمال ہے۔ اور خدا کی نظر میں دونوں ہی یکساں طور پر جرم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بدلہ لینا

قرآن میں ارشاد ہوا ہے : وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم بہ (اگر تم بدلہ لو تو اسی کے مثل بدلہ لو جو تمہارے ساتھ کیا گیا ہے ، النحل ۱۲۶)

یہاں الفاظ بظاہر عام ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب لینا سراسر غلط ہوگا کہ کوئی شخص آپ کو گالی دے تو آپ بھی اس کے جواب میں اس کو اسی طرح گالی دینے لگیں۔ یہاں اگرچہ کوئی شرط مذکور نہیں مگر وہ یہاں مفہوم (understood) ہے۔ وہ شرط یہ کہ تم جو بدلہ لو وہ اسلامی اخلاق کے دائرہ میں ہو نہ کہ اس سے باہر۔ معروف اخلاقی حدود کے اندر رہتے ہوئے ہی ہم اپنے کسی مخالف کا جواب دے سکتے ہیں نہ کہ معروف اسلامی اور اخلاقی حدود کے باہر۔

مثلاً اگر کسی نے ہمارے خلاف نعرہ لگایا ہے تو ہم اس کو پتھر نہیں مار سکتے۔ کسی سے ہم کو اصولی اختلاف ہے تو ہم الزام تراشی کے انداز میں اس کا جواب نہیں دے سکتے۔ کسی قوم کے ایک فرد نے زیادتی کی ہے تو ہم اس قوم کے دوسرے افراد سے اس کا بدلہ نہیں لے سکتے۔ کسی نے الفاظ کے ذریعہ ہماری دل آزاری کی ہے تو ہم گولی اور بم سے اس کو سزا نہیں دے سکتے۔ کسی نے ہم کو مالی نقصان پہونچایا ہے تو ہم اس کو قتل کرکے اس سے انتقام نہیں لے سکتے۔

اسی کے ساتھ اس کو بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ بدلہ لینے کی بھی ایک حد ہے۔ مومن اسلامی اخلاق کے باہر جاکر کسی سے بدلہ نہیں لے سکتا۔ مثلاً کوئی گالی دے تو وہ اس کو گالی نہیں دے گا۔ کوئی الزام تراشی کرے تو وہ اس کے جواب میں الزام تراشی نہیں کرے گا۔ کوئی شخص کمینہ پن کا انداز اختیار کرے تو وہ اس کے لیے کمینہ نہیں بن جائے گا۔

ایسے مواقع پر مومن کو بدلہ لینے کے بجائے اعراض کرنا ہے۔ مومن اسلامی اخلاق کے دائرہ میں بدلہ لے سکتا ہے۔ اگر معاملہ اسلامی اخلاق کے دائرہ کے باہر کا ہو تو وہ خود صبر کرے گا اور معاملہ کو خدا کے حوالے کرکے خاموش ہو جائے گا۔

برابر کا بدلہ لینا اسلام میں جائز ہے۔ مگر بدلہ لینا اتنا نازک کام ہے کہ جو شخص خدا سے ڈرتا ہو وہ اس کو زیادہ محفوظ طریقہ سمجھے گا کہ بدلہ لینے کے بجائے اسے معاف کر دے۔

شک سے بچیے

جو لوگ آخرت کو (یا امورِ غیب کو) نہیں مانتے، وہ کس نفسیات کے تحت ایسا کرتے ہیں، اس کو قرآن کی سورہ نمبر ۲۷ میں بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ آخرت کے بارہ میں ان کا علم الجھ گیا ہے۔ بلکہ وہ اس کے بارہ میں شک میں مبتلا ہیں بلکہ وہ اس سے اندھے بنے ہوئے ہیں (بل ادّارك علمهم في الآخرة بل هم في شك منها بل هم منها عمون) النمل ۶۶

اس آیت میں اِدّارَکَ کا لفظ بے حد اہم ہے۔ ادّارک کی اصل تدارکَ ہے۔ پھر ادغام کے اصول کے مطابق، ت کا حرف دال میں مدغم ہوگیا (لسان العرب ۱۰/ ۴۱۹) ادّارک یا تدارک کے ابتدائی معنی ہیں باہم مل جانا۔ قرآن میں ہے کہ حتیٰ اذا ادّارکوا فیہا جمیعا (یہاں تک جب وہ سب لوگ اس میں اکٹھا ہو جائیں گے)

مختلف چیزیں جب اکٹھا ہوتی ہیں تو اس کا ایک نتیجہ اختلاط کی صورت میں نکلتا ہے۔ یعنی چیزیں باہم مل کر گڈمڈ ہو جاتی ہیں۔ اس طرح ادّارک میں اختلاط اور گڈمڈ ہونے کا مفہوم پیدا ہوگیا۔ مذکورہ آیت میں اس لفظ کا یہی نتیجہ والا مفہوم مراد ہے۔ یعنی آخرت کے بارہ میں مختلف رایوں کی وجہ سے ان کے اندر ذہنی الجھن کی کیفیت پیدا ہوئی جو بالآخر شک اور اندھے پن تک پہنچ گئی۔

موجودہ دنیا دار الامتحان ہے۔ اس مصلحت کی بنا پر یہاں التباس (الانعام ۹) کا قانون جاری ہے۔ یہاں حقیقتوں کو برہنہ صورت میں نہیں لایا جاتا بلکہ ملتبس صورت میں لایا جاتا ہے۔ کوئی حقیقت خواہ کتنے ہی زیادہ دلائل کے ساتھ ثابت کر دی جائے، ایک عنصر اس میں اشتباہ والتباس کا باقی رہتا ہے۔ یہی چیز شک کا باعث بنتی ہے۔ آدمی اس شک والے پہلو کو لے کر طرح طرح کے شبہات میں مبتلا ہو جاتا ہے یہاں تک کہ ایسا ہو جاتا ہے گویا وہ اندھا ہے اور اسے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

یہ شک کا پہلو امتحان کا تقاضا ہے۔ اس لیے وہ لازماً موجود رہے گا۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنی عقل سے کام لے کر شک کے پردہ کو پھاڑے۔ اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو وہ اس دنیا میں کبھی یقین کے مقام کو حاصل نہیں کر سکتا۔

شک سے بچیے۔ شک تمام گمراہیوں کا سب سے بڑا دروازہ ہے۔

صبر و تقویٰ

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اس دنیا کی ہر چیز ہم نے جوڑا جوڑا پیدا کی ہے (الذاریات ۴۹) یہ فطرت کا ایک آفاقی اصول ہے۔ یہاں جب بھی کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے وہ دو چیزوں کے تعامل سے رونما ہوتا ہے۔ کوئی بھی چیز تنہا اس دنیا میں کوئی واقعہ یا نتیجہ ظاہر نہیں کر سکتی۔

اس اصول کا تعلق اجتماعی زندگی سے بھی ہے۔ اسی کو ایک پرانی مثل میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ ایک آدمی اپنا ہاتھ فضا میں ہلاتا رہے تو اس سے تالی نہیں بجے گی۔ تالی بجنے کے لیے ضروری ہے کہ دوسرا ہاتھ اس سے ٹکرائے۔ جب تک دوسرا ہاتھ نہ اٹھے تالی کا بجنا بھی رکا رہے گا۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ مخالف کی ضرر رسانی کا معاملہ بھی یہی ہے۔ مخالف کی ضرر رسانی کا ارادہ اس وقت کامیاب ہوتا ہے جب کہ فریق ثانی بھی اپنی نادانی یا سادہ لوحی سے اس کے ساتھ تعاون کا معاملہ کر بیٹھے۔ فریق ثانی اگر "دوسرا ہاتھ" بننے سے رک جائے تو دشمن کی مخالفانہ تالی بھی بجنے والی نہیں۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ کچھ لوگ اہل اسلام کو نقصان پہنچانے پر تلے ہوئے ہیں۔ ان کو اہل اسلام سے سخت بغض اور عداوت ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ :

وإن تصبروا وتتقوا لا يضركم كيدهم شيئا إن الله بما يعملون محيط (آل عمران ۱۲۰)

اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ کی روش اختیار کرو تو ان کی کوئی تدبیر تم کو کچھ بھی نقصان نہ پہنچائے گی۔ جو کچھ وہ کر رہے ہیں سب اللہ کے بس میں ہے۔

اس آیت کی تشریح اس طرح کی جا سکتی ہے کہ ــــــ دشمن کی سازش صرف ۵۰ فی صد کی حد تک کارگر ہے۔ وہ اپنی تکمیل تک صرف اس وقت پہنچتی ہے جب کہ فریق ثانی اپنی کسی غلطی سے اس کے منصوبہ کا بقیہ ۵۰ فی صد حصہ پورا کر دے۔ صبر و تقویٰ اس بات کی ضمانت ہے کہ اس کے منصوبہ کا یہ بقیہ نصف حصہ دشمن کو حاصل نہ ہو۔ جب ایسا ہوگا تو اس کی مخالفانہ تدبیر لازمی طور پر بے نتیجہ ہو کر رہ جائے گی۔

اس قانون کے تحت اللہ تعالیٰ نے آپ کے معاملہ کو خود آپ کے ہاتھ میں دے دیا ہے۔

حدیدی کردار

لقد ارسلنا رسلنا بالبینات وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط وانزلنا الحدید فیہ باس شدید و منافع للناس و لیعلم اللہ من ینصرہ ورسلہ بالغیب ان اللہ قوی عزیز (الحدید)

ہم نے اپنے رسول بھیجے نشانیوں کے ساتھ اور ان کے ساتھ کتاب اور ترازو اتارا تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔ اور ہم نے لوہا اتارا اس میں سخت طاقت ہے اور لوگوں کے لئے فائدہ ہے۔ اور تاکہ اللہ جان لے کہ کون مدد کرتا ہے اللہ اور رسول کی بن دیکھے۔ بے شک اللہ قوی اور زبردست ہے۔

موجودہ دنیا کو خدا نے اس طرح بنایا ہے کہ یہاں مادی چیزیں انسانی اخلاقیات کے لئے تمثیل کا کام کرتی ہیں۔ اوپر کی آیت میں اس سلسلہ میں دو چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک میزان (ترازو) اور دوسرے حدید (لوہا)

ترازو کیا کام کرتا ہے۔ ترازو تولنے کا ذریعہ ہے۔ کسی چیز کے متعلق جاننا ہو کہ وہ وزن میں پوری ہے یا کم ہے تو اس کو ترازو میں رکھ کر تولتے ہیں۔ اس سے اس کی حالت پوری طرح معلوم ہو جاتی ہے۔ خدا کی کتاب اسی طرح انسانی اخلاقیات کے لئے ترازو ہے۔ عام ترازو چیزوں کے وزن کو بتاتا ہے اور خدا کی کتاب اعمال کے صحیح یا غلط ہونے کو۔ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کا رویہ موجودہ دنیا میں درست رہے تاکہ وہ آخرت کی کامیابی حاصل کرے اس کے لئے لازم ہے کہ وہ خدا کے ترازو سے اپنے قول وعمل کو تولتا رہے۔ اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو وہ اگلی دنیا میں ناکام ونامراد ہو کر رہ جائے گا۔

دوسری تمثیل حدید (لوہے) کی ہے۔ حدید کی معروف حیثیت کیا ہے۔ وہ قابل اعتماد شدت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ جس پل یا عمارت کو لوہے پر کھڑا کیا جاتے اس کے بارہ میں پورا اعتماد رہتا ہے کہ وہ طوفانوں کے مقابلہ میں بھی پوری طرح قائم رہے گی۔ اسی قسم کے انسان خدا کے دین کی نصرت کے لئے درکار ہیں۔ خدا کے دین کی نصرت وہ لوگ کر سکتے ہیں جن کے اندر حدیدی کردار ہو۔ جن کے قول پر پورا اعتماد کیا جا سکے۔ جو مشکل حالات میں بھی کوئی کمزوری نہ دکھائیں، جو نفس اور شیطان کے دباؤ کے مقابلہ میں اسٹیل کی طرح بے لچک ثابت ہوں۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

تصحیح

ماہنامہ الرسالہ فروری ۱۹۹۸، صفحہ ۲۵ کی آخری سطر اور صفحہ ۲۶ کی ابتدائی تین سطریں کسی قدر تبدیلی کے ساتھ براہ کرم اس طرح پڑھیں :

میں نہایت پرجوش باتیں کیں۔ ان کی بات کو ان کے ایک ساتھی نے مذکورہ تاریخ کے تحت اپنی دستخط کے ساتھ حسب ذیل الفاظ میں لکھا: "ہندستان سے علاحدگی کے بعد جو کشمیر بنے گا، انشاء اللہ وہ کشمیر اسلامی کشمیر ہوگا" اس تحریر کے نیچے ڈائری میں میری رائے ان الفاظ میں لکھی ہوئی ہے: "میرے

ایڈیٹر ماہنامہ الرسالہ

اُردو

تذکیر القرآن جلد اول 200/-
تذکیر القرآن جلد دوم 200/-
اللہ اکبر 45/-
پیغمبر انقلاب 40/-
مذہب اور جدید چیلنج 55/-
عظمتِ قرآن 35/-
عظمتِ اسلام 50/-
عظمتِ صحابہ 7/-
دین کامل 60/-
الاسلام 45/-
ظہورِ اسلام 50/-
اسلامی زندگی 30/-
احیاءِ اسلام 35/-
رازِ حیات 65/-
صراطِ مستقیم 40/-
خاتونِ اسلام 60/-
سوشلزم اور اسلام 40/-
اسلام اور عصر حاضر 30/-
الربانیہ 40/-
کاروانِ ملت 45/-
حقیقتِ حج 30/-
اسلامی تعلیمات 25/-
اسلام دور جدید کا خالق 25/-
حدیث رسولؐ 35/-
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار) 85/-
سفرنامہ (ملکی اسفار)
میوات کا سفر 35/-
قیادت نامہ 30/-
راہِ عمل 25/-
تعبیر کی غلطی 70/-
دین کی سیاسی تعبیر 20/-
عظمتِ مومن 7/-
اسلام ایک عظیم جدوجہد 4/-
منزل کی طرف 2/-
فکر اسلامی 50/-
طلاق اسلام میں 3/-
دین انسانیت 60/-

شتم رسول کا مسئلہ 40/-
مطالعہ سیرت —
ڈائری جلد اول 80/-
کتابِ زندگی 55/-
انوارِ حکمت —
اقوالِ حکمت 25/-
تعمیر کی طرف 8/-
تبلیغی تحریک 20/-
تجدیدِ دین 25/-
عقلیات اسلام 35/-
مذہب اور سائنس –
قرآن کا مطلوب انسان 8/-
دین کیا ہے 7/-
اسلام دین فطرت 7/-
تعمیر ملت 7/-
تاریخ کا سبق 7/-
فسادات کا مسئلہ 5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان 5/-
تعارفِ اسلام 5/-
اسلام پندرھویں صدی میں 5/-
راہیں بند نہیں 12/-
ایمانی طاقت 7/-
اتحادِ ملت 7/-
سبق آموز واقعات 7/-
زلزلۂ قیامت 10/-
حقیقت کی تلاش 8/-
پیغمبر اسلامؐ 5/-
آخری سفر 7/-
اسلامی دعوت 7/-
خدا اور انسان —
حل یہاں ہے 10/-
سچا راستہ 8/-
دینی تعلیم 7/-
امہات المومنین 20/-
تصویر ملت 85/-
دعوتِ اسلام 50/-
دعوتِ حق 40/-
نثری تقریریں 65/-

اسفارِ ہند —
اسلام ایک تعارف —
حیاتِ طیبہ 7/-
باغِ جنت 7/-
نارِ جہنم 7/-
خلیج ڈائری 10/-
رہنمائے حیات 7/-
مضامینِ اسلام —
تعددِ ازدواج 7/-
ہندستانی مسلمان 40/-
روشن مستقبل 7/-
صومِ رمضان 7/-
علمِ کلام —
اسلام کا تعارف 4/-
علماء اور دور جدید 8/-
سیرتِ رسولؐ —
ہندستان آزادی کے بعد 1/-
مارکسزم تاریخ جس کو
رد کرچکی ہے 8/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ 8/-
الاسلام یتحدیٰ (عربی) 85/-
یکساں سول کوڈ 5/-
اسلام کیا ہے 8/-

ھندی

سچائی کی تلاش 8/-
انسان اپنے آپ کو پہچان 4/-
پیغمبر اسلامؐ 4/-
سچائی کی کھوج —
آخری سفر 8/-
اسلام کا پرچے 8/-
پیغمبر اسلام کے مہان ساتھی 8/-
راستے بند نہیں 7/-
جنت کا باغ 8/-
بھوتنی واد اور اسلام 7/-
اتہاس کا سبق 9/-
اسلام ایک سوابھاوک مذہب 8/-
اجول بھوش 8/-
پوتر جیون 8/-

A Treasury of the Qur'an 75.00
Words of the Prophet Muhammad 85.00
Muhammad: A Prophet for All Humanity —
An Islamic Treasury of Virtues —
The Life of the Prophet Muhammad 75.00
Sayings of Muhammad 95.00
The Beautiful Commands of Allah 125.00
The Beautiful Promises of Allah 175.00
The Soul of the Qur'an 125.00
The Wonderful Universe of Allah 95.00
Presenting the Qur'an 165.00
The Muslim Prayer Companion —
Indian Muslims 65.00
Islam and Modern Challenges 95.00
Islam: The Voice of Human Nature 30.00
Islam: Creator of the Modern Age 55.00
Woman Between Islam and Western Society 95.00
Woman in Islamic Shari'ah 65.00
Islam As It Is 55.00
Religion and Science 45.00
The Way to Find God 20.00
The Teachings of Islam 25.00
The Good Life 20.00
The Garden of Paradise 25.00
The Fire of Hell 25.00
Man Know Thyself 8.00
Muhammad: The Ideal Character 8.00
Tabligh Movement 40.00
Polygamy and Islam 7.00
Hijab in Islam 20.00
Concerning Divorce 7.00
Uniform Civil Code 10.00

RNI 28822/76 • U(SE) 12/98
Delhi Postal Regd. No. DL/11154/98